ایک خوشبو اڑی اڑی سی

[illegible]

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

۱۶

نئے افسانے

سلسلۂ مطبوعاتِ مکتبۂ افکار کراچی

(۱۲)

پاکستان میں جملہ حقوقِ اشاعت
بحق مکتبۂ افکار کراچی محفوظ ہیں

قیمت

[redacted]

کرشن چندر

ایک خوشبو اڑی اڑی سی

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

کتابت ——— منیر احمد دہلوی

طباعت ——— ایجوکیشنل پریس کراچی

ناشر ——— مکتبۂ افکار، کراچی

تعداد ——— ایک ہزار

فہرست

۱	جنتا سے اجنتا تک	۹
۲	گل دان	۲۴
۳	ایک خوشبو اڑی سی	۴۷
۴	کھٹے انار، میٹھے انار	۸۷
۵	چینی پنکھا	۹۹
۶	موہن جوداڑو کا خزانہ	۱۲۹
۷	پرنتیو	۱۴۰
۸	دودھ کا دودھ، پانی کا پانی	۱۶۶
۹	بیمار باپ	۱۸۱

۱۰	بلّی اور وزیر	۱۹۷
۱۱	وزیروں کا کلب	۲۱۸
۱۲	اشوک کی موت	۲۴۴
۱۳	چور	۲۶۱
۱۴	بے داغ فولاد	۲۸۲
۱۵	دل کسی کا دوست نہیں	۲۹۷
۱۶	سپیرن	۳۲۰
۱۷	کرشن چندر۔ ایک مطالعہ	۳۴۷

پاکستان اور بھارت کے
تہذیبی رشتوں کے نام

کرشن چندر

جنتا سے اجنتا تک

ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو رہا ہو، یا اگر حادثہ ہو جائے جب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں گذر رہے ہیں۔ لیکن ریل گاڑی میں کمرے اور عالم یوں یکایک نہیں بدلتے، بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس لئے مجھے ریل گاڑی میں سفر کرنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کالے انجن والی گاڑی میں، جو کوئلے اور پانی سے چلتی ہے۔ بمبئی کی ایلکٹرک ٹرین تو بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سر کٹا ہوا ہے۔ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کا سر کدھر ہے دُھڑ کدھر ہے کبھی

منزر سے چلنے لگتی ہے کبھی دُھڑسے ۔ بمبئی میں آپ نووارد ہوں ، اور یہ گاڑی آپ کو اسٹیشن پر کھڑی دکھائی دے تو آپ خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ گاڑی شمال کو جائے گی یا جنوب کو؟ اکثر اسی دھوکے میں بہت سے لوگ چرچ گیٹ جاتے جاتے بوری بندر پہونچ جاتے ہیں ۔ ایسی چار سو بیس گاڑی ہے یہ ۔ ڈیموکریٹک سوشلزم کی طرح دائیں بائیں اس کی سمت کا کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ لیکن آپ کالے انجن والی گاڑی کے متعلق یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتے ۔ جب کوئلے اور پانی سے بھرپور انجن شعلے اُڑاتا ہوا ، بھاپ پیدا کرتا ہوا اپنی چمنی سے دُھواں نکالتا ہوا پچیس ڈبوں کی ایک لمبی قطار کو کھینچتا ہوا مغرورانہ انداز میں اسٹیشن یارڈ کے اندر دوڑتا ہوا آتا ہے ، تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاتح جرنیل کی سواری آرہی ہے ۔ مُسافر حرکت میں آجاتے ہیں ۔ خوانچے والے صدائیں دینے لگتے ہیں ، اور جاہل سے جاہل مُسافر بھی سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی اُدھر جائے گی جدھر انجن لگا ہوا ہے ۔ سمت معلوم ہو تو سفر میں دھوکے کھانے کا کم احتمال ہے ۔

اسی لئے جب میں مدراس جنتا ایکسپریس میں بیٹھا تو گاڑی کے آگے کالے انجن کے دیو کو دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ یہ گاڑی مدراس ہی جائے گی ، کہیں سمندر میں لے کے نہیں ڈوب جائے گی ۔ اس کے علاوہ جنتا ایکسپریس میں ایک اور بھی خوبی ہے یعنی اس میں سارے ڈبے تھرڈ کے ہیں جنتا ایکسپریس

جو تھی۔ دراصل ۱۵ اگست کی آزادی کے بعد ہمارے حاکموں نے بہت سے معاملے صاف کردیئے ہیں جنہیں انگریزوں نے بُری طرح اُلجھا رکھا تھا یعنی صاحب پہلے درجہ اوّل، پھر دوم، پھر اِنٹر، پھر درجہ سوم۔ جنتا ایکسپریس نے وہ معاملہ ختم کردیا ہے۔ اب دو درجے، بلکہ دو ہی قسم کی گاڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک تو جنتا کی گاڑی جس پر جنتا سفر کرتی ہے۔ دوسری اجنتا گاڑی ہے جس میں اجنتا کی تصویروں سے مشابہت رکھنے والی خواتین اور ان کے شوہر سفر کرتے ہیں۔ جنتا اور اجنتا میں جو امتیاز آج سے ہزاروں برس پہلے تھا وہ آج بھی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر محسوس ہوتا ہے۔

میرے ساتھ کرشن تھا — دُبلا پتلا اور بے حد بوکھلایا ہوا۔ اُس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی ٹکٹ گھر بھول آیا ہے۔ غلط گاڑی میں سوار ہے۔ کسی اجنبی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا نام کرشن چندر ہے۔ ٹکٹ میرے بٹوے میں ہے۔ سامان ریک کے اوپر ہے اور گاڑی مدراس جارہی ہے۔ تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی سے سر نکال کر کنگھا خریدنے لگا۔

کرشن میری طرف دیکھ کے مسکرا کے کہنے لگا —

"میں پریشان تھا کہ کیا چیز بھول آیا ہوں؟ اب یاد آیا کنگھا۔

تم لائے ـــ ؟ "

میں نے کہا ـــ

"لایا تو نہیں، لیکن بھولا بھی نہیں !"

"ارے، یہ کیسے ممکن ہے؟ لائے بھی نہیں، بھولے بھی نہیں !"

"ہاں !" میں نے کہا ـــ "لایا اس لئے نہیں کہ بھولا نہیں، اور بھولا اس لئے نہیں کہ کنگھے کی حاجت نہیں۔ ذرا کچھ اوپر سے یعنی اس ویک پر بیٹھ کر میرے سر کی طرف دیکھو تو کیا یہ معلوم نہ ہوگا جیسے یہاں کسی آدمی کا سر نہیں طبلے کا بایاں رکھا ہے۔

کرشن پہلے تو خوب ہنسا ـــ پھر تھوڑا سا ہنسا ـــ اور آخر میں بالکل سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگا ـــ

"مذاق چھوڑو ـــ یہ بتاؤ کہ وائیکم پہونچ کر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

اتنا کہہ کر اس نے نوٹ بک نکالی اور قلم ہاتھ میں لے لیا۔ اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو ـــ

"بتاؤ ـــ"

میں نے کہا ـــ

"میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر رقم کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہا —

"گاڑی تو چلنے دو!"

گاڑی چل رہی تھی — زمین چل رہی تھی — آسمان چل رہا تھا —— ہم سفر چل رہے تھے — میں خود چل رہا تھا۔ اپنے عظیم الشان ساتھیوں کے ساتھ چلنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہانیاں اس لئے لکھنی شروع کی تھیں کہ شاید کبھی زمین اور آسمان کو اپنے تخیل کے ساتھ چلا سکوں لیکن الفاظ کے ساتھ الفاظ کو رکھتے ہوئے کبھی اضطراری حرکت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جو زمین کے سینے میں اور آسمان کی بلندی میں محفوظ ہے۔ کیوں میرا قلم زمین کا محور نہیں بن جاتا۔ اور ایک بھالے کی طرح اونچے آسمان کا سینہ گھائل نہیں کر سکتا؟ پھر سوچتا ہوں: میں بھی کتنا احمق ہوں۔ لفظ کے ساتھ لفظ جوڑنا تو ایسا ہے جیسے اینٹ کے ساتھ اینٹ جوڑنا — دیوار چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

اسی طرح یہ گاڑی بھی اکیلے کس نے بنائی ہے؟ جانے کتنے ہزاروں ہاتھ لگے۔ دماغ چلے گھنٹے صرف ہوئے۔ اس کے لئے کان کھودنے والوں نے لوہا نکالا — کوئلہ اور سیمنٹ تیار کیا۔ جنگل سے درخت کاٹے گئے۔ زمین کے سینے سے پانی ماں کے دودھ کی طرح ابھرا۔ پھر کہیں آگ

پیدا ہوئی۔ کتنے سالوں کی محنت مشقت، پسینے اور لہو کی آمیزش سے یہ گاڑی مجھ تک پہونچی۔ میں نے اپنے چھوٹے سے قلم کی محنت سے یہ گاڑی ذرا آگے ڈھکیلی۔ سچ مچ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

ہاں، اتنی محنت کے بعد جب ریل کی کھڑکی سے زمین اور آسمان حرکت میں آتے ہیں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ہی تصویر سامنے سے گذرتی جا رہی ہے۔ اور کبھی ایک نہیں تین تین تصویریں ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھومتی ہوئی ایک عجیب دل نواز تواتر اور ہم آہنگی سے سامنے سے گذرتی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی آنکھ کے اُفق پر حرکت کی تین سطحیں نمودار ہوتی ہیں۔ لَے کے تین زیر و بم آہنگ کے تین تأثرات ایک ہی لمحے میں اُجاگر ہوتے ہیں۔ جیسے جب گاڑی چلتی ہے تو سب سے پہلے تار کے کھمبے حرکت میں آتے ہیں۔ پھر اُن کے ساتھ ساتھ درخت اور جھاڑ جھنکاڑ وجد میں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے کھیت، اور کھیتوں کے اندر فصل، اور فصل کے اندر کھڑے ہوئے کسان گھومتے ہیں۔ کبھی تار کے کھمبوں کے پیچھے کھیت غائب ہو جاتے ہیں اور ایک اُونچی گھاٹی ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اونچی گھاٹی ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے تھک جاتی ہے تو اچانک آگے ایک ندی اپنے شفاف پانی کے ساتھ گنگناتی ہوئی اُبھر آتی ہے۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک اونچے ٹیلے کے

پیچھے گم ہو جاتی ہے ۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن ایک جھلک دکھا کر گھونگھٹ کاڑھ لے ۔ اب سامنے ایکھ کے درخت میں کسان صرف اپنے گھٹنوں تک نظر آتا ہے ۔ جہاں ایکھ کے کھیت ختم ہوتے ہیں، وہاں نظر بہت نیچے کو گر جاتی ہے ۔ گاڑی اب ایک پل پر سے گذر رہی ہے ۔ پل کا ایک حصہ نظر آ رہا ہے ۔ اور پل کے نیچے ندی کا پاٹ بھی، جو اب بالکل سوکھ گیا ہے ۔ اور جس کی بھوری ریت میں دور تک بیل گاڑی کے نشان بنے ہوئے ہیں ۔ آنکھ کے افق پر یہ نشان بہت دور تک جاتے ہیں ۔ کس کی بیل گاڑی تھی وہ؟ کون لایا تھا اسے یہاں؟ کدھر گئی وہ بیل گاڑی؟ بیل گاڑی آنکھ کے افق سے زمین کے افق پر منتقل ہو جاتی ہے ۔ اور نئی تصویر ابھرتی آتی ہے ـــــ

ایک اونچے سے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے، اور اس کی بڑی بہن ہے ۔ بڑی بہن کے ہاتھ میں درانتی ہے ۔ چھوٹا لڑکا گاڑی کی طرف دیکھ کے ہنستا ہے اور زبان نکال کر منہ چڑاتا ہے ۔ بڑی لڑکی شرما جاتی ہے ۔ گاڑی میں اسے کسی نے محبت بھری نظروں سے دیکھا ۔ محبت جو ایک لمحے کے لئے جھلکی، اور اس ٹیلے پر جھلک کر جاوداں ہو گئی ۔ کتنے لوگوں نے انسان کی اس ایک لمحے کی لازوال محبت کی کہانی لکھی ہے ۔ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

کرشن نے کہا "سگریٹ پیو گے؟"

میں نے کھڑکی کے اندر سر کر لیا اور کہا۔ "ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا، پی سکتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ منہ میں رکھا اور ابھی ماچس جلائی نہ تھی کہ میری نظر سامنے ایک عورت پر پڑی جو تیسرے بنچ پر بیٹھی اپنی ننھی کا فراک بدلنے میں مصروف تھی۔ جب ہماری نظریں ملیں تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، مجھے ایک لمحے کے لئے دھوکا ہوا۔ پھر خیال آیا۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ میں نے آئینے میں اچھی طرح اپنی صورت دیکھی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں۔ لیکن وہ عورت مجھے ابھی تک دیکھ رہی تھی۔ عجیب نگاہوں سے۔ اور لڑکی کا فراک اُس کی ہاتھ میں پھنسا ہوا تھا۔ آخر میں نے نگاہ پھیری، اور لڑکی کے چلانے پر فراک ہاتھ سے نکل کر جسم پر آ گیا۔ عورت نے پھر عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں سوال نہ تھا، نفرت بھی نہ تھی۔ ایک عجیب طرح کی سمجھ تھی۔ جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ میرے اس قدر قریب ہو۔ ایک ایسی رازداری اور قربت کی سمجھ، اور اس سمجھ کا احساس مجھ تک پہونچا دینے کے جذبے کی صورت ہی اس نگاہ میں تھی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ سفر کی کئی منزلیں گذر گئیں۔ آفتاب غروب ہو گیا کھڑکی جو آئینہ جہاں تھی ایک تاریک روزن کی طرح نظر آئی جہاں جنگا

پر آسمان کی ہلکی نیلاہٹ باقی رہ گئی تھی۔

اسی طرح کئی بار میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ اور جب تاریک ڈبّے کے اندر روشنیاں جلیں تو اُس کی نگاہوں کی اُداسی اور ایک عجیب سی محبت نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں دیکھنے لگا، مجھ میں کیا ہے جو اُس کے خاوند میں نہیں۔ وہ تو بہت اچھا تگڑے جسم کا ڈیل ڈول والا گبھرو جوان ہے۔ فرق یہی ہے کہ اس نے دھوتی پہن رکھی ہے اور میں نے پتلون۔ فرق یہی ہے کہ میں نے شیو نہیں بنایا اور اس نے شیو بنا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے دو تین رشتے دار بیٹھے ہیں، جو سب آپس میں بے تکلف ہیں، اور ایک دوسرے سے ہنستے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ نیا فراک پہنے ہوئے ننھی بچی میری طرف دیکھ کے مسکراتی ہے۔ پھر وہ میرے قریب آجاتی ہے۔ میں اُسے ایک سنترہ دیتا ہوں۔ باپ میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا ہے۔ لیکن وہ عورت اب میری طرف نہیں دیکھ رہی ہے۔ لیکن میں نے دیکھ لیا ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

یہ آنسو کس لئے ہیں؟ میرے لئے تو نہیں۔ اتنی جلدی کون اپنے دل کے موتی میرے لئے رول سکتا ہے۔ پھر یہ اُداسی کیوں؟ اجنبی عورت! بتا دے، تیرے دل کا غم کیا ہے؟ کیا تیرا خاوند تجھ سے پیار نہیں کرتا؟ کیا

تیری ساس ظالم ہے؟ کیا تو اپنے میکے میں کسی سے محبت کرتی تھی؟ اور آج وہ وادیاں تجھ سے دور کھو گئی ہیں؟ — لیکن یہ آنسو کچھ نہیں بتاتے، وہ بھی تو آنسو تھے جو گرے اور پھر ملّو کے ایک جھٹکے سے پونچھ ڈالے گئے۔
میں نے سوال کو سمجھا ہی نہیں اجنبی عورت! جواب کیا دوں؟

اب رات زیادہ جا چکی ہے۔ کیوں کہ روشنیاں تیز معلوم ہوتی ہیں۔ جب اندھیرا بڑھ جاتا ہے تو معمولی روشنی بھی بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حالت میری تھی۔ اس کے احساس کی معمولی سی چنگاری بھی مجھے محبت کا شعلہ معلوم ہوتی تھی۔ نہیں ہوتی تھی، مگر پھر بھی معلوم ہوتی تھی۔

وہ کھانا پروسنے لگی۔ اُس کے خاوند نے اور اُس کے دوسرے ساتھیوں نے فرش پر بہت سے ٹرنک ایک دوسرے کے ساتھ ان پر اخبار بچھا دیئے۔ اور وہ عورت ایک اونچے ٹفن کیریر میں سے کھانا نکال نکال کر پروسنے لگی۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے خاوند کے دوستوں کو کھانا دیا، پھر اپنے خاوند کو — اپنے خاوند کو کھانا دیتے ہوئے یکایک اُس کی انگلیاں اپنے خاوند کی انگلیوں سے جا لگیں، اور یکایک میں نے محسوس کیا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے کہ اس عورت کو اپنے خاوند سے محبت نہیں۔ میں ان انگلیوں کے لمس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب انگلیاں انگلیوں سے چھو جاتی ہیں، ایک لمحے کے لئے رک جاتی ہیں۔ رک کر ایک دوسرے سے کھیلنے لگتی ہیں۔

اور اس سے پہلے کہ لوگوں کی توجہ اس طرف جائے جلدی سے گھبرا کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ یہ وفادار اور عظیم محبت کی انگلیاں ہیں۔ میں انہیں پہچانتا ہوں۔ ان کی عزت و احترام کرتا ہوں۔ میں بھی ان انگلیوں سے کھیلا ہوں۔ بچپن میں اور لڑکپن میں اور جوانی میں۔ یہ انگلیاں ممتا اور موہ کے بارے کانپتی ہوئی انگلیاں، جو بچوں کو پالنے میں سُلاتی ہیں، جو شوہروں کے سینے پر محبت کی شرمائی ہوئی آرزوؤں کی طرح دھیرے دھیرے سرکتی ہیں۔ انگلیاں جو چاول چنتی ہیں، خط لکھتی ہیں اور آتشدان پر اپنے شوہر کی تصویر رکھتی ہیں۔ انگلیاں جو چولہا سلگاتی ہیں، گھر بناتی ہیں گھر میں رہتی ہیں۔ اس وقت بھی جب گھر میں کوئی اور نہیں رہتا۔ اس وقت بھی جب مرد میدانِ جنگ کو چلے جاتے ہیں، اور یہ انگلیاں دعا کے لئے آسمان کی سمت اُٹھ جاتی ہیں۔

یہ انگلیاں اپنے خاوند سے رخصت ہو کر جھک گئیں جس طرح محبت کی شاخ ثمر بار ہو کر جھک جاتی ہے۔ اب کھانا ننھی سی لڑکی اور اس عورت کے لئے بچا تھا۔ کھانا کھانے سے پہلے اُس نے پھر میری طرف دیکھا، اور اُس کے ہاتھ میں ایک اضطراری جنبش ہوئی جیسے میری طرف پیکنا چاہتی تھی جیسے کہنا چاہتی تھی ——

"تم بھی کھا لو یہ کھانا۔ آؤ شریک ہو جاؤ۔"

اور پھر ایک بے تابی اور بے چینی سے وہ جنبش وہیں ختم کر دی گئی۔
اور اُس نے سر جھکا کے اپنی ننھی لڑکی کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔
کرشن نے کہا۔ "کھانا کھاؤ گے؟"
میں نے کہا۔ "ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی نہیں کھاؤں گا۔"
"کیوں؟"
"بس صرف پھل کھاؤں گا۔"
میں نے تھیلے میں سے دو تین سیب اور چند نارنگیاں نکالیں۔ سیب کاٹنے کے لئے چاقو ڈھونڈنے لگا۔ چاقو کرشن کے پاس نہیں تھا۔ سامنے کی برتھ پر کسی مسافر کے پاس نہیں تھا۔ ناچار تیسری برتھ والوں سے کہنا پڑا۔ وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔
اُس کے شوہر نے اُس سے پوچھا۔
"چاقو تمہارے پاس تو ہوگا؟"
اُس عورت نے جلدی سے اپنا کھانا چھوڑ اپنا چابیوں کا گچھا نکالا، چابیوں کے گچھے کے ساتھ ایک چاقو بھی بندھا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی، اور اُس کی انگلیوں نے بہت گہرے لمس کے ساتھ میری ہتھیلی پر وہ چابیوں کے گچھے والا چاقو رکھ دیا۔ میں نے اُس کا تیز اُڑتا ہوا سانس اپنے رخسار پر محسوس کیا۔ اُس کی انگلیوں کے گہرے لمس کو جو مجھ سے اتنا قریب

تھا جیسے وہ مجھ سے بغل گیر ہو رہی تھی۔
یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا۔ دوسرے لمحے میں وہ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ اور اس کے خاوند نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور میں نے چاقو کے پھل کو سیب کے سینے میں اُتار دیا۔ کاش چاقو خواہشوں کو اتنی آسانی سے کاٹ سکتا ــــ یہ دل کے اندر کون گہرے گہرے پھندے بُن رہا ہے؟

کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ جلدی جلدی سامان باندھنے لگے، شاید ان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ عورت نے لڑکی کا فراک پھر بدل دیا اُس کے بالوں میں کنگھی کی، اور اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ خاوند نے ایک ٹرنک کے اُوپر دوسرا ٹرنک رکھ کے سارے ٹرنک سمیٹ لئے دوستوں نے بستر باندھے ــــ پھر گاڑی دھیمی ہوگئی اور وہ لوگ چلنے لگے دوست آگے آگے چلے۔ پھر ایک دوست نے ننھی کو اٹھا لیا۔ آخر میں وہ اور اس کا خاوند رہ گیا۔

وہ اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ پھر اُس نے اپنے خاوند سے کچھ آہستہ سے کہا۔ اور پھر وہ کچھ کہہ کر آہستہ سے میری طرف مڑی، اور رُک کر حسرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھ کے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

اُس کا خاوند بھی میری طرف مُڑا ۔۔ میں حیرت اور سکتے میں تھا لیکن اُس کے خاوند نے جلد ہی میری حیرت دور کر دی ۔ اُس نے مسکرا کے کہا ۔ "صاحب آپ تو حیران ہوں گے کہ یہ کیا ماجرا ہے ؟ لیکن بات بھی اچنبھے کی ہے ۔ یہ میری بیوی ہے ۔ اس کا بھائی ابھی دو ماہ ہوئے فوت ہوا ہے ۔ اس سے آپ کی شکل اتنی ملتی ہے کہ میں کیا کہوں ۔ یہ جو مڑ مڑ کر آپ کو دیکھ رہی تھی ۔ اس کے جذبات کا اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔"

عورت کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپک پڑے ۔ خاوند نے اسے دھیرے سے میری جانب سے موڑ لیا ، اور ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا ۔

"آپ بُرا مت مانئے گا۔"

وہ دونوں چلے گئے ۔۔

جاتے ہوئے عورت کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں ، وہ انگلیاں جو میرے سر پہ پیار اور شفقت کا بوسہ دینا چاہتی تھیں ۔

اپنی تمام غریبی اور بے بسی اور انتہائی غم کے باوجود انسان کی دُنیا کتنی انوکھی اور پیاری ہے ۔ یہ انسان کی ہری بھری دنیا کتنی چھوٹی چھوٹی محبتوں سے تعمیر ہوئی ہے ۔۔

بہن کی محبت ۔ خاوند کی محبت ۔ بچے کی محبت ۔ اجنبی کی محبت ۔ کتنی اَن گِنت چھوٹی چھوٹی محبتوں کو ساتھ جوڑ جوڑ کے انسان نے اپنی

محبت کی معراج بنائی ہے۔

دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے؟

کرشن نے کہا۔

"ساتھی! تمہیں وائیکم امن کانفرنس کے لئے اپنی تقریر تیار کرنا ہے، اب کر ڈالو۔"

میں نے ایک عجیب محویت کے عالم میں کہا۔

"یہ انسانوں سے پیار کرنے والی انگلیاں اُن انگلیوں سے کتنی مختلف ہیں جو انسانوں پر ایٹم بم گراتی ہیں!"

گُل دان

برگانزا کی خفیہ بار سے جب میں اور میرا چگی داڑھی والا مصوّر دوست کمٹے پی کر نکلے تو ہم دونوں کے پیروں میں اسپرنگ لگ چکے تھے لیکن کمٹے کے قدم مجھ سے کچھ زیادہ ہی لڑکھڑا رہے تھے، اور وہ ایک بدمست بکرے کی طرح نشے میں جھولتا دکھائی دے رہا تھا، اور اُس کی پتلی چگی داڑھی بھی ہوا میں اسی طرح جھولتی دکھائی دیتی تھی۔ حالانکہ کمٹے آج ہی اس بار میں پہلی بار مجھ سے ملا تھا۔ لیکن ملتے ہی اس کھلے انداز میں، کچھ ایسے پیارے جھکی انداز میں ملا کہ میں اس سے بور ہوتے ہوئے بھی اس کا قائل ہو گیا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مصوّر کیسا ہے؟ مگر اس کی باتوں سے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ آدمی دلچسپ ہے اور باتونی اور

جھکی ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے ، اور آج کل کے مشینی دور میں تو انسان اس قدر سپاٹ ، غیر دلچسپ اور یکساں سے ملتے ہیں ، گویا ایک ہی ٹھپّا اور سانچے میں ڈھالے گئے ہوں ۔ کرنسی نوٹوں کی طرح ۔ صرف چہروں کا نمبر مختلف ہوتا ہے ۔

اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں کمٹے کو اُس کے گھر تک پہونچا دوں ۔ لیکن جب میں نے اپنا عندیہ اُس پر ظاہر کیا ، تو وہ بے حد خفا ہوا ۔

" ابے جا سالے ، تو کیا سمجھتا ہے میں اکیلا اپنے گھر نہیں جا سکتا " اُس نے اِتنا کہا ، پھر مجھ سے الگ ہو کر مخالف سمت کو دَوڑنے لگا ۔ گویا میری صُورت سے بھی بیزار ہو چکا ہو ۔

میں نے دَوڑ کر اسے پکڑ لیا ، اور اسے دونوں شانوں سے ہلاتے ہوئے کہا " جانتے ہو اِس وقت رات کے دو بجے ہیں ۔ راستے میں جگہ جگہ پولیس ملے گی ۔ مجھے تمہارا تو ڈر نہیں ہے ۔ ڈر ہے وہ لوگ کہیں تمہاری یہ خوبصورت بُش شرٹ نہ اُتار لیں " ۔

بڑگانزا کی بار میں سب سے پہلے کمٹے کی بش شرٹ نے ہی مجھے اپنی طرف کھینچا تھا ۔ بڑی خوب صُورت بُش شرٹ تھی ۔ اس کا کپڑا تو نہایت معمولی موٹا اور کھردرا تھا ۔ لیکن اس پر مصوّر نے اپنے ہاتھ سے نقش و نگار اُبھارے

تھے، دونوں کالروں پر چیلوں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جب میں نے پوچھا "یہ کیوں ہے؟"، تو کمٹے نے جواب دیا "اس لئے کہ ہم غریب انسان کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔"

سینے پر ایک نیم برہنہ عورت کی تصویر تھی۔ کیوں کہ کمٹے کے خیال میں ہر مرد کے دل میں، اگر وہ مرد ہے، تو یہی ایک تصویر ہوتی ہے۔

دونوں جیبوں کے باہر کرانسی نوٹوں کی شبیہہ مقدس تھی جس کے بارے میں مجھے کبھی مزید استفسار کرنا تضیع اوقات معلوم ہوا۔

گہرے سبز رنگ کی بش شرٹ کو پہن کر جب کمٹے شام کے وقت باہر نکلتا تو ہر راہ گیر کی نگاہیں اُس پر پڑتیں۔ بلا مبالغہ پورے شہر میں اور کسی کے پاس ایسی نادر بش شرٹ نہ ہو گی۔ میرا جی بہت چاہا کہ میں کمٹے کے بدن سے یہ بُش شرٹ اُتروا لوں۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں اس قسم کی جرأت کی ہمت نہ پڑی۔

کمٹے کو اپنی بُش شرٹ پر بڑا ناز تھا۔ وہ بے حد اپنائیت سے اُس کی طرف دیکھ کر بولا — "کیوں؟ پولیس والے میری بش شرٹ کیوں اُتار لیں گے؟"

میں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اس کو پہن کر تم عریانی کا اشتہار معلوم ہوتے ہو۔"

"تو وہ میری بجائے ایلورا اور کھا جوراؤ کے مندروں کو کیوں گرفتار نہیں کرتے؟"

کمٹے نے چڑ کر میرے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے جھٹک دیئے، اور منہ بسور کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

میں نے اُس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا، اور آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

اتفاق سے ایک خالی ٹیکسی دھیرے دھیرے جا رہی تھی۔ کمٹے نے فوراً ہاتھ کا اشارا کر کے اسے روک لیا۔ ہم دونوں خاموشی سے اُس میں بیٹھ گئے۔ کمٹے نے ہرا کے کہا ––

"کماٹی پورہ –– نو نمبر کی گلی سات نمبر کی چال۔"

"بہت اچھا بادشاہو!"

ٹیکسی والے پنجابی نے بھی لہرا کے کہا، اور ٹیکسی تیز کر دی۔ وہ بھی پیئے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹیکسی کو سڑک سے ہٹا کر ٹرام کے پٹے پر چلنے لگا، اور تار، ٹیلی فون اور بجلی، ٹرام کے کھمبے آپس میں یوں گڈمڈ ہونے لگے کہ میں نے چلّا کے کہا ––

"ٹیکسی روکو! ٹیکسی روکو!"

ٹیکسی والے نے گنگناتے ہوئے زور سے بریک لگائی ٹیکسی جھولتے

ہوئے ایک دم رک گئی۔ ٹیکسی والا مجسم سوال بنا ہوا میری طرف دیکھنے لگا۔ گھٹے بھی!

میں نے کہا "تم ٹیکسی کہاں چلا رہے ہو؟"۔

"سڑک پر۔"

"مگر یہ تو ٹرام کا پٹہ ہے۔"

"تو کیا ہوا، سڑک تو یہ بھی ہے، اور میں تو اس وقت ٹیکسی کو ٹرام کے پٹے پر تو کیا ہوا پر بھی چلا سکتا ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے!" میں نے سنجیدگی سے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا ۔۔ "لیکن ہمیں ٹیکسی کا سڑک پر چلنا ہی پسند ہے۔ اس لئے۔!"

میں چپ ہو گیا۔

ٹیکسی والے پنجابی کو میری بزدلی پر سخت غصہ آیا، مگر آدمی شریف تھا، اس لئے فوراً خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس نے ٹیکسی ٹرام کے پٹے سے ہٹا لی، اور نیچے سڑک پر چلانے لگا بے تحاشا تیز انداز میں۔

"دھیرے چلاؤ۔۔!"

"دھیرے چلانے والے کی ماں کی......." ٹیکسی چلانے والا منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، اور اس نے ٹیکسی کی رفتار اور تیز کر دی، اور زور زور سے گنگنانے لگا۔۔۔

اساں تینوں نہیں چھڈنا
بھاویں ورے دی قیداں ہو لے

ہم تمہیں نہ چھوڑیں گے
چاہے ایک برس کی قید ہو جائے

اِس گیت کے بول سننے کے بعد کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی وصیت کی، اور اس منظر کا تصوّر کرنے لگا۔ جب میری بیوی سرکاری مردہ خانے میں میری لاش دیکھے گی، اور چھاتی پر دو ہتھڑ مار کر کہے گی — "ہائے میرے بھولے خاوند! تم نے جیتے جی اپنی زندگی کا بیمہ بھی نہ کرایا —!"

مگر اتفاق ایسا ہوا کہ راستے میں کوئی پولیس جیپ نہ ملی۔ "اللہ نیر فضل" اور "ست گرو تیری اوٹ" والی کوئی لاری نہ ملی۔ بوچڑ خانے کا ٹرک یا سرکاری ڈیری سے دودھ لے جانے والا ٹریلر تک نہ ملا، اور ہم لوگ چند منٹ میں کماٹی پورہ کی نو نمبر کی گلی کی سات نمبر کی چال کے باہر پہنچ گئے۔

ٹیکسی والے نے کھٹاک سے میٹر اٹھاتے ہوئے کہا —

"دو روپے چودہ آنے!"

گمٹے نے اپنی بش شرٹ کی دونوں جیبوں میں باری باری ہاتھ ڈالا

جہاں کرنسی نوٹوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، لیکن اندر سے ایک نوٹ تو کیا، ایک آنے کی ریزگاری تک بھی دستیاب نہ ہوئی۔ آخر میں نے دو روپے چودہ آنے دے کر جان چھڑائی۔ لیکن کمٹے نے میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے الٹا مجھے گھور کر دیکھا، اور بولا: "تم یہاں کیوں اتر پڑے؟ اس ٹیکسی کو اپنے گھر کیوں نہ لے گئے؟"

"اس لئے کہ میں تمہاری تصویریں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"رات کے دو بجے؟ جاؤ۔ جاؤ مسٹر اپنے گھر جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر کمٹے اپنی چال کی طرف مڑا، مگر مڑتے ہی فٹ پاتھ کے کونے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا، اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دے کر چال کے چرخ چوں زینہ پر چڑھنے لگا۔ تیسری منزل کے غربی کونے پر اس کا کمرہ تھا۔ میں نے کمٹے کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کی کنجی ڈھونڈھ نکالی، اور اسے تالے کے سوراخ میں گھمایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کمٹے نے کہا۔

"بائیں جانب دیوار پر بجلی کا سوئچ ہے۔"

میں نے سوئچ دبا کر روشنی کی تو دیکھا کہ سارا کمرہ تصویروں سے اٹا پڑا ہے۔ مختلف سائز کی تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ کونوں میں پڑی تھیں۔ فرش پر رکھی ہوئی عجیب بے بسی کے عالم میں چھت کو دیکھ رہی

کفیں۔ بلب کی روشنی کمزور تھی، اس لئے وہ ہوا میں معلّق ایک اُبلا ہوا زرد انڈا سا معلوم ہوتا تھا۔

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں تصویروں کو نہیں دیکھ رہا ہوں یہ تصویریں مجھے دیکھ رہی ہیں کہ یہ کون اجنبی ہے جو ہم میں گھس آیا ہے۔ کمٹے کی تصویروں کے رنگ بڑے گہرے اور تڑپتے ہوئے سے تھے، لہراتے ہوئے کربناک رنگ، ایسے رنگ جو بیمار اور اعصاب زدہ معلوم ہوتے تھے، رنگ جو طعنہ دیتے تھے، جو زندگی کی چکنی تہوں کے اندر کی کھردری اور تکلیف دہ حقیقتوں کا سامنا کراتے تھے، اور ایک مضحکہ خیز انداز میں دیکھنے والے پر ہنستے تھے۔ مجھے کمٹے کی تصویریں بالکل پسند نہیں آئیں، مجھے تو آبی رنگوں کا دھیما دھیما امتزاج پسند ہے۔ جب ایک رنگ غیر محسوس طریق پر دوسرے رنگ کی سطح میں گھل مل جاتا ہے۔ جہاں درخت عورتوں کی طرح حسین ہوتے ہیں، اور عورتیں درختوں کی طرح ثمردار، جہاں مردوں کے جسم بانسری کے نغمے کی طرح لچک دار معلوم ہوتے ہیں، اور بانسری کے نغمے کنول کے پھولوں کی صورت میں جھیل کے پانیوں پر نغمہ سرا معلوم ہوتے ہیں۔

"کیوں کیسی رہیں میری تصویریں؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کمٹے کمرے کے وسط میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنی پھیلی ہوئی ٹانگوں سے فرش پر ٹھک ٹھک کر رہا تھا ـــــ اُس کی

اَدھ مُندی آنکھوں میں ایک عجیب ذہین چمک ہو یدا تھی ۔۔۔ ذہین اور طنز آمیز۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی ۔ ایک نظر چاروں طرف تصویروں پر گھمائی اور بڑی بے خوفی سے کہا۔

"تم مصور نہیں مسخرے ہو۔"

"اس میں کیا شبہ ہے !" ۔۔۔ کمٹے نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔" میں مصور بعد میں ہوں کارٹون ساز پہلے ہوں ۔ میں ونکرو یکلی کے لئے کارٹون بناتا ہوں ، اور فرصت کے اوقات میں مصوری کرتا ہوں ۔ اس دنیا میں یہ بات کتنی عجیب ہے کہ جس بات سے انسان کو روٹی ملتی ہے اس کام سے اُسے محبت نہیں ہوتی ۔ مجھے اکثر ان لوگوں کے خلاف کارٹون بنانے کو کہا جاتا ہے جن کی میں دل سے عزت کرتا ہوں ۔ اس لئے ان لوگوں کے کارٹون بناتے بناتے کئی بار مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ پر تھوک رہا ہوں اور جب سالہا سال اسی طرح تھوکتے ہوئے گذر جائیں تو انسان کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔"

کمٹے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ۔ پھر میری طرف اُنگلی اُٹھا کر بولا ۔" اب اگر تم کسی بازار ، گلی یا کسی بڑے مجمع میں سے گذرو ، تو چہروں کو غور سے دیکھنا ۔ تمہیں ان میں انسانوں کے چہرے کم اور تھوک دان

زیادہ نظر آئیں گے۔"

میں نے گھبرا کر اپنے چہرے کو ہاتھ سے چھوا، اور فوراً ہی ہاتھ ہٹا لیا، اور اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا "تمہیں اپنے کام سے اگر اتنی ہی نفرت ہے تو اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کیوں نہیں اختیار کر لیتے"

سکیٹے نے ایک اُنگلی میری طرف اٹھائی، اور بولا "نہیں تم غلط سمجھے، مجھے کارٹون بنانے سے نفرت نہیں ہے، لیکن جب مجھے اپنی مرضی کے خلاف کارٹون بنانے کے لئے کہا جاتا ہے، اُس وقت مجھے اپنے کام سے نفرت ہو جاتی ہے"

سکیٹے چُپ ہو گیا۔ یکایک اُداس ہو کر بولا "کبھی کبھی سوچتا ہوں مجھے کوئی ایسا کام کر لینا چاہیے جس میں مجھے سوچنا نہ پڑے جیسے بازار میں جھاڑو دینے کا کام"

"اس میں بھی سوچنے کی ضرورت ہے" میں نے کہا "آدمی اگر سلیقے سے جھاڑو نہ دے تو ہر راہ چلتے کے چہرے کو کارٹون بنا سکتا ہے!"

سکیٹے نے میرے مزاح کو نظر انداز کرتے ہوئے شدید کرب کے عالم میں کہا "پھر میں کیا کروں؟ کیا میں گوبھی کا پتہ بن جاؤں یا پیاز کا چھلکا؟"

اب میں کچھ سنجیدہ ہو چلا تھا، اس لئے میں نے اس سے تہدیدی انداز میں کہا: "حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت کا مارا ہوا انسان گوبھی کا پتہ

بن سکتا ہے نہ پیاز کا چھلکا!"

"پھر میں کیا کروں؟" سکمیٹے جوش کے عالم میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب اُس کے چہرے پر فرشتے کا رنگ نہیں تھا۔ وہ گہرا تڑپتا ہوا رنگ تھا جو اس کی تصویروں کا تھا۔ اس وقت مجھے وہ خود ایک تصویر معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے غصے میں کہا ــــ "اِس غلط کار دنیا میں مجھ ایسا انسان اپنے ڈھب کا کام کہاں سے ڈھونڈھے؟ اپنی تخلیق کے درد کو اپنے خواب کے بیٹے کو، اپنے جذبے کی معراج کو، کہاں سے حاصل کرے؟"

"اس کے مختلف راستے ہیں!" میں نے طنزاً کہا: "لیکن ان میں سے کوئی راستہ برگانزا کے بار میں سے ہو کر نہیں گذرتا۔" میں ہنسنے لگا۔

"مت ہنسو!" سکمیٹے جوش میں چلّایا۔ "جب ایک گندی: تھکا دینے والی غلیظ ماحول میں بستی ہوئی مل سے ایک مزدور نکل کر گھر کی بجائے سیدھا تاڑی خانے کا رُخ کرتا ہے تو اس کے تاڑی پینے پر مت ہنسو! جب ایک پرائیویٹ فرم میں سوا سو تنخواہ پانے والا ــــ بُڈھا اکاؤنٹنٹ دس گھنٹے آنے پائیاں جوڑتے جوڑتے تھک کر دفتر سے باہر نکلتا ہے تو شفق غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ رات کے سائے پھیل رہے ہوتے ہیں۔ اس آدمی نے برسوں سے شفق نہیں دیکھی۔ پھولوں کو کھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کھلتی ہوئی پنکھڑیوں پر شبنم کو برستے ہوئے نہیں دیکھا

برستی ہوئی انکھڑیوں سے گرتی ہوئی حسرتوں کو نہیں دیکھا۔ پھر وہ انسان گھر کی بجائے کسی رنڈی کے کوٹھے پر چلا جائے تو اس کی عقل کا ماتم مت کرو۔ دنیا کا کوئی درد کسی پر ہنسنے یا رونے سے کم ہوا ہے؟"

کمٹے چپ ہو گیا۔ ایکا ایک اپنی شدتِ احساس سے گھبرا کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور دھیرے سے بولا ــــ

"جب ایک بے کار نوجوان دن بھر دفتروں، فرموں، کارخانوں، دکانوں کے چکر لگا کر نا امید اور مجبور ہو کے اپنی گندی چال کے غلیظ کمرے میں اپنی طرح کے بے کار ساتھیوں کے ساتھ گھنٹوں شطرنج کھیلتا ہے تو اُسے سست، کاہل، بے کار اور نکما مت سمجھو۔ دیکھو کس نفرت سے وہ شہ کو مات دیتا ہے! ہر انسان ہر موقعے پر اپنی عقل سمجھ اور مزاج کے مطابق ایک راستہ چن لیتا ہے۔"

"اُس راستے پر انسان ہمیشہ بھٹکتا ہے۔" میں نے اس سے بڑے پیار سے کہا "مگر اس وقت یہ بحث بے کار ہے۔ تم یہ بتاؤ تم نے اپنے لئے کون سا راستہ اختیار کیا ہے؟"

کمٹے نے بچوں کی طرح کے شریر اور فتح مند اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے؟ ــــ میں نے اپنے چہرے کے اندر ایک اور چہرہ چھپا لیا ہے۔ دنیا کے راستے پر چلتے چلتے کبھی ایک انسان کے دو انسان بن

جاتے ہیں، اور آج کل تو ہر انسان اپنی کھال کے اندر ایک سیاہی جوڑا چھپائے پھرتا ہے۔ ایک انسان کے اندر ایک اور انسان —— ایک انسان تو میرے اندر وہ انسان ہے جو اپنی مرضی کے خلاف کارٹون بناتا ہے، کُڑھتا ہے، جلتا ہے، جھینکتا ہے، مگر "ونکرو یکل" کے مالک کی مرضی پر چلنے کے لئے مجبور ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو مصور ہے اور صرف اپنی مرضی سے کام کرتا ہے، وہ — صرف وہ تصویر بناتا ہے جس کے لئے اس کی روح نے مجبور کیا ہو۔"

"کیا تم روح پر اعتقاد رکھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

کملے نے چڑ کر کہا: "مجھے معلوم ہے تمہارے ایسے لوگ روحوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ مگر میں رکھتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے اس دنیا میں صرف چلتے ہوئے جسم بھی دیکھے ہیں۔ ایسے جسم جو چل رہے تھے لیکن جن کے اندر کوئی روح نہ تھی۔ وہ چل رہے تھے اور بڑی مضبوطی سے چل رہے تھے۔ لیکن ان کے خشونت بھرے چہروں کی سختی اور رعونت کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں انسانوں کو نہیں دیکھ رہا ہوں، فولاد کے خالی ڈبوں کے اندر جھانک رہا ہوں —— مضبوط لیکن خالی، چمکتے ہوئے لیکن خالی، خوب صورت برانڈ اور رنگین لیبل سے مزین لیکن اندر سے خالی۔ کیا تمہیں کبھی کسی انسان کے خالی پن کو دیکھ کر کسی وجود کی کمی کا

احساس نہیں ہوتا؟"

"ان معنوں میں تو ہوتا ہے جیسے شیو کے بعد داڑھی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم سے بحث کرنا بے کار ہے۔" کھٹے نے چڑ کر کہا اور مجھ سے منہ پھیر لیا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی چگی داڑھی میں اُلجھا دیئے اور حزنیہ لہجے میں بولا۔ "میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے اندر مجھ سے الگ کوئی روح ضرور موجود ہے، لیکن ایک تصویر ضرور موجود ہے، یا ایک تصویر کی خواہش کی تصویر ضرور موجود ہے، جس کے لئے میں ہمیشہ سے سرگرداں ہوں۔ یہ تصویر میں اب تک نہیں بنا سکا، حالانکہ میں نے اب تک سیکڑوں تصویریں بنا ڈالی ہیں۔ لیکن ان تصویروں میں کہیں بھی مجھے وہ تصویر نہ ملی جس کی مجھے تلاش ہے۔ جس خالی ڈبے ہی ملے۔ بہت ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ اس تصویر میں کہیں پر ایک روح تھی جو ابھی اُٹھ کر چلی گئی۔ "وان گوگ" کی "خالی کرسی" کی طرح! ـــ ہاں مگر ـــ ایک بار ـــ!

مگر میں اُس کی بک بک سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ آپ عدالت میں ہر روز پیشیاں بھگتنے والے سرکاری وکیل سے اس قسم کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے میں اُس کی باتوں سے قطعاً متاثر نہ ہو کر ایک تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ایزل پر ٹنگی ہوئی تھی، اور ابھی نامکمل تھی۔ یہ تصویر مٹی کا

گل دان

کے ایک گملے کی تھی جس میں گلاب کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ گملا جگہ جگہ سے اس طرح ٹوٹا ہوا تھا جیسے کسی نے زور سے ہتھوڑا مار کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہوں۔ پھر بھی گلاب کے پھول ہوا میں معلق تھے اور ان میں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"اس تصویر کا کیا مطلب ہے؟" میں نے کمٹے سے پوچھا "کوئی بیہودہ سوریئل خیال؟"

کمٹے اٹھ کر یکایک اپنے ایزل کے پاس یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی حملے سے بچاؤ کے لئے اپنی ایزل کی مدافعت اور حفاظت پر آمادہ ہو۔ آہستہ سے بولا "تمہیں شان اوکاسی مشہور آئرش شاعر کے وہ مصرعے کا ہے کو یاد ہوں گے! "تم گلاب کے گل دان کو توڑ سکتے ہو۔ لیکن فضا پھر بھی پھولوں کی مہک سے رچی رہے گی!"

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کیوں کہ سرکاری وکیل کو ہر روز ظلم سے واسطہ رہتا ہے۔ وہ ظلم میں جیتا ہے اور اسی کا کمیشن کھاتا ہے۔ میں نے اس تصویر سے ہٹ کر اپنی نگاہیں کھڑکی کی طرف پھیر لیں جہاں ایک بڑے چوکھٹے پر کالا کپڑا پڑا تھا۔ میں اس چوکھٹے کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اسے مت چھوؤ" یکایک کمٹے چلا کر اور چھلانگ مار کر میرے اور

کالے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تصویر کے بیچ میں آ گیا۔

"یہ تصویر میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔"

"کیوں نہیں دکھا سکتے؟"

"اس لئے کہ اس تصویر کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا ــ "بھئی اس قدر نشے میں کوئی نہ ہو۔ آنکھیں تو میں رکھتا ہوں۔ اپنی ان آنکھوں سے میں نے تمہاری ان دوسری تصویروں کو دیکھا ہے۔ ان آنکھوں سے کیا میں اس تصویر کو نہیں دیکھ سکتا ــ؟"

"ممکن ہے دیکھ لو۔ ممکن ہے نہ دیکھ سکو۔" کمٹے نے یکایک قریب کے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تصویر میری زندگی کی محرومی اور اس کی ناکامی کی سب سے بڑی داستان ہے اور کوئی بھی اپنی محرومی کی انتہائی ذلت کو کسی دوسرے پر واضح کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ تصویر میری زندگی کا شاہکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اس سے بہتر تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی لیکن جہاں جہاں بھی میں نے اس تصویر کو نمائش کے لئے بھیجا، وہاں سے یہ تصویر انعام پائے بغیر واپس آ گئی۔ میری دوسری تصویروں کو انعام بھی ملا، مگر میرے شاہکار کی آج تک کسی نے قدر نہ کی۔ تصویریں پرکھنے والے جج اس تصویر کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ چپ چاپ اسے دیکھتے تھے۔ پھر

سر جھکا کر آگے چلے جاتے تھے۔ کیا وہ لوگ واقعی آنکھ نہیں رکھتے؟ کیا وہ لوگ واقعی نہیں دیکھ سکتے کہ میں نے اس تصویر میں کیا رکھ دیا ہے؟"

"کیا رکھ دیا ہے؟" میں تصویر کو دیکھے بغیر کمٹے کے قریب صوفے میں دھنس گیا، اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس سے بڑی محبت سے پوچھا۔

کمٹے کی نگاہیں اس کالے کپڑے پر جم گئیں جیسے وہ کوئی اسکرین کا پردہ ہو۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"وہ بڑی ملگجی سی شام تھی، اور میں اپنی اسکیچ بک اور پنسل ہاتھ میں لئے کسی مزیدار کارٹون کی تلاش میں شہر کے بازاروں اور کوچوں سے چلتا، گھومتا، مڑتا، لوگوں سے بچتا، ٹکراتا، ایک ایسے علاقے میں پہونچ گیا جہاں اس سے پہلے میں کبھی نہ گیا تھا۔ یہاں گلیاں اس قدر تنگ و تاریک تھیں، موریوں میں غلاظت کے اتنے انبار جمع تھے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے ایسی سڑاند آتی تھی کہ میں سوچنے لگا کہ شاید اس علاقے کے مکینوں کی ناکیں نہ ہوتی ہوں گی۔ کیوں کہ یہ تو نا ممکن ہے کہ آدمی اپنے چہرے پر ایک ناک رکھے، اور پھر ایسی جگہ رہ سکے۔ دو تین جگہوں پر تاریکی میں ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ان اندھیری گلیوں میں ناک تو کیا آنکھ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ آنکھ روشنی کے لئے ہوتی ہے اور روشنی

کے بغیر کوئی تصویر نہیں بن سکتی۔ پھر میں اِن اندھیری گلیوں میں کیوں گھوم رہا ہوں؟ میں نے گھبرا کر آسمان کی طرف نگاہ ڈالی، تاریک بادلوں سے گھرا ہوا آسمان بھی ان گندی گلیوں پر ایک گدلی اور مٹیالی چھت کی طرح جھکا ہوا تھا۔"

"بڑے جھکی ہو دوست!" میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے کسی طرح اصل موضوع تک تو پہونچو۔"

کمٹے نے بے حد بے چین ہو کر کہا۔ "موضوع اور موڈ میں ایک گہرا تعلق ہے۔ میں تمہیں کیونکر اور کیسے سمجھاؤں، اس تاریک گلی کا ماحول جس کے نکڑ پر ایک روشن بازار شروع ہوتا تھا ––– اور جہاں پر اس تاریکی اور اُجالے کا اتصال ہوتا تھا، وہاں بجلی کا ایک کھمبا تھا، پوسٹ آفس کا ایک لیٹر بکس تھا، پانی کا نل تھا، قریب کے ہوٹل کے کوڑے کا ایک ڈھیر تھا اور اس کے قریب چار یا پانچ بھکاری فٹ پاتھ پر بیٹھے بھیک مانگ رہے تھے۔"

"احمق!" میں نے اُس سے پوچھا۔ "بھلا بھیک کیوں مانگ رہے تھے؟ جہاں پانی کا نل ہو، بجلی کی روشنی ہو، گھر خط ڈالنے کے لئے لیٹر بکس ہو، اور ہوٹل کا لذیذ کھانا ہو، انسان کو اور کیا چاہئے؟ اچھے سے اچھے فلیٹ میں بھی ایک جگہ اتنی سہولتیں مشکل سے مل سکتی ہیں!"

کمٹے نے غصے میں کہا۔ "کیا تم ہر جگہ سرکاری وکیل بنے رہتے ہو؟

کبھی کسی جگہ انسان نہیں بن سکتے ؟ مصیبت اور درد کا مذاق اڑائے بغیر نہیں رہ سکتے ؟ روشنی اور تاریکی کے اتصال پر کھڑے ہو کر تمہارا ضمیر کانپنے کیوں لگتا ہے ؟ — کیوں سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے ؟ بہر حال مجھے تم سے کیا واسطہ ! آج تم ایک مصور کے کمرے میں آئے ہو ابھی تھوڑی دیر میں اس ماحول سے جدا ہو کر اپنے روشن ماحول میں چلے جاؤ گے۔ اور تم زندگی بھر اس کو نہ دیکھ سکو گے۔ کیوں کہ اب تو میں نے اس تصویر کو کسی نمائش میں بھیجنے کا خیال بھی ترک کر دیا ہے۔ وہ سب کے سب تصویریں پرکھنے والے تمہاری طرح سرکاری وکیل ہیں "۔

میں چپ ہو گیا —

دور گھڑیال نے تین بجائے۔ کمٹے چونک کر بولا۔ تاریکی جا رہی ہے۔ اجالا آ رہا ہے۔ لیکن میری تصویر کی قسمت میں نہ جانے کب تک تاریکی لکھی ہے ؟ میں اس تصویر کو نہیں بھول سکتا۔ وہ بھکاری عورت لیٹر بکس کا سہارا لئے جانے کتنے دنوں کی بھوکی پیاسی وہیں پڑی تھی۔ دوسرے فقیر پھر بھی اپنی کمزور آواز میں صدا لگاتے تھے۔ لیکن وہ بھکاری عورت سب سے الگ تھلگ لیٹر بکس سے لگی ہوئی چپ چاپ فضا کو گھور رہی تھی۔ اسے کسی کے خط کا انتظار تھا ؟ مگر کیسی مایوس نظر تھی اس کی ؟ جیسے اس کی قسمت کا لیٹر بکس اب کبھی نہ کھلے گا۔ وہ بالکل برہنہ تھی۔ صرف

رانوں پر ایک ذرا سا چیتھڑا تھا، ورنہ وہ بالکل برہنہ تھی، اور اپنے جسم کی برہنگی سے بالکل بے نیاز پڑی تھی۔ لیکن اس کے جسم کی برہنگی پر کسی عریانی کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بارش کی بوچھاڑ اور آفتاب کی تمازت اور کھلی ہوا کے تھپیڑوں اور فٹ پاتھ کے ننگے پتھروں کی رگڑ کھا کھا کر اس کے کپڑوں کا ہر تار ناپید ہو چکا ہے صرف ایک چیتھڑا تن ڈھانکنے کو رہ گیا ہے۔ جسے اس نے اپنی رانوں میں ڈال کر اپنی طرف سے ستر پوشی کر لی تھی — برہنہ ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل برہنہ نہ تھی، کیوں کہ جسم کے ہر حصے پر میل کی اتنی تہیں جم چکی تھیں جیسے وہ عورت نہ ہو کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ہوا ایک زنگ آلود لوہے کا ٹکڑا ہو، بے کار، بے مصرف، بے حس، بدصورت، بے ہنگم، بدنما۔ شاید یہ مورت کبھی گلاب ہوگی، شاید یہ بد ہیئت پستان کسی معصوم بچے کے لبوں میں دودھ کا لبریز جام ہوں گے۔ شاید ان ہونٹوں کی نازک پنکھڑیوں پر کسی شاعر کو گلاب کی مہک آئی ہوگی۔ شاید کسی صدی کے کسی موڑ پر یہ عورت بھی ایک خوب صورت گل دان میں رکھی گئی ہوگی لیکن آج وہ گل دان ٹوٹ چکا ہے۔ وہ گلاب مسلا جا چکا ہے۔ آج اس گلاب کی مہک بھی باقی نہیں ہے۔ شاید شان اوکاسی نے جو کہا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا —— تم گل دان کو توڑ سکتے ہو، لیکن پھولوں کی مہک پھر بھی فضا میں

اپچی ایسے گی ! ___ کدھر ہے شان اوکاسی ! آئیے اپنے آئرلینیڈ کے مرغزاروں سے اور اس عورت کی زندگی کا نوحہ دیکھے ! ___ ایسا میں سوچ رہا تھا ___ اور کھڑا کھڑا یہی طے کر رہا تھا کہ میرے سامنے جو کچھ ہے وہ کارٹون ہے یا تصویر ہے ؟ میں نے ابھی اپنی اسکیچ بک کھولی ہی تھی کہ اتنے میں پولیس کی جیپ کی وحشیانہ سائرن سنائی دی۔ ایک کے بعد دوسری۔ معلوم ہوا کہ محکمۂ صفائی کے وزیر ادھر سے گذرنے والے ہیں اس لئے سڑک پر سے ٹریفک ہٹایا جا رہا ہے، اور فٹ پاتھ کے جمگھٹ کو کم کیا جا رہا ہے۔ پھیری والے اُٹھ اُٹھ کر فٹ پاتھ سے سرکنے لگے۔ بھیک مانگنے والے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ بھکاری عورت وہیں کی وہیں پڑی رہ گئی۔

" اتنے میں ایک جیپ لیٹر بکس کے قریب آکر رکی، اس میں سے پولیس کے دو سپاہی اُترے، اور انہوں نے چلا کے اُس بھکاری عورت سے کہا ___

"ہے! اٹھو یہاں سے، وزیر صاحب کی سواری آرہی ہے !"

بھکاری عورت نے اپنی آنکھیں کھولیں، بڑی بے بسی سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ بے بسی سے اپنی برہنگی کو دیکھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک چھوٹا سا چیتھڑا تھا جسے اُس نے

اپنی رانوں پر ڈال رکھا تھا، اس سے اس کی ستر پوشی ہو گئی تھی، اب وہ اُٹھے تو اپنی ستر پوشی کیسے کرے؟

اُس نے بڑی بے بس نگاہوں سے پولیس کے سنتریوں کی طرف دیکھا۔ لیکن ہر شخص تو نگاہوں کی مجبوری نہیں پڑھ سکتا، ورنہ آج یہ دنیا بہت مختلف ہوتی۔

"ہے! اُٹھو یہاں سے" پولیس کے دونوں سپاہی اسے اُٹھانے کے لئے آگے بڑھے۔

وہ بھکاری عورت یکایک گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ مادر زاد ننگی تھی — بالکل برہنہ! چیتھڑا فٹ پاتھ کے فرش پر گر گیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر اسے فرش سے اٹھا لیا۔ اگلے چند لمحوں میں اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اسے کہاں رکھے۔ اپنی رانوں پر، یا اپنے پستانوں پر، یا کہیں اور، اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا، اور وہ فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ وہ جسم کے کس حصے کو اس چیتھڑے سے چھپا لے!

یکایک اس نے اپنے چاروں طرف ان بے حیا اور بے شرم نگاہوں کو دیکھا جو گویا اس کے بدن کے روئیں روئیں میں گھسی جا رہی تھیں۔ اس عورت نے گھبرا کر اور شرما کر اپنا چہرہ اس گندے چیتھڑے میں چھپا لیا، اور باقی سارے جسم کو برہنہ چھوڑ کر سپاہیوں کے ساتھ ساتھ آگے

کو چل دی ——

—— تم گل دان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر سکتے ہو لیکن گلاب کی مہک پھر بھی فضا میں رچی رہے گی!"

یکایک کمٹے نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا، اور سسک سسک کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

بہت دیر تک میں اس چوکھٹے پر پڑے ہوئے کالے کپڑے کے سامنے کھڑا رہا۔ کتنی ہی صدیاں، کتنے ہی ہزاروں سال گویا گزر گئے، اور میں اس کالے کپڑے کے سامنے کھڑا رہا —— مجھ میں ہمت ہی نہ تھی کہ میں اس کالے کپڑے کو ہٹا کر اس تصویر کو دیکھوں۔

لیکن آخر کار میں نے ہمت کر کے ایک ہی جھٹکے میں اس تصویر کو ننگا کر دیا۔ دوسرے لمحے میں میں چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس تصویر کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سرکاری وکیل نہیں ہوں —— ملزم ہوں، اور مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں،

ایک خوشبو اُڑی سی

جب سے فرینچ پرفیومرز لمیٹڈ نے چرنی گیٹ میں فرانسیسی عطروں کی دکان کھولی تھی، بمبئی کے فورٹ کے علاقے میں اُس کی سیلز گرلز کی دھوم مچ گئی تھی۔ فرینچ پرفیومرز لمیٹڈ کا مالک بلونت رائے ایک ہندوستانی تھا، جو ایک عرصے سے پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا۔ وہیں پر اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کی تھی، وہیں پر اس کے پانچ لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ پچیس برس کے بعد وہ اپنے وطن لوٹ آیا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ یہاں پر آکر بھی اس کا ارادہ اپنے پرانے پیشے کو جاری رکھنے کا تھا، مگر اس کی بیوی مادام سدسنا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی مٹھائیاں بیچنا غلط ہوگا

اگر وہ پیرس میں ہندوستانی مٹھائی بیچتا تھا تو اسی قاعدے سے ہندوستان میں فرانسیسی عطر بیچنا چاہیے۔ ماداموسوتا تجارت کے اصول بہت اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔ اُسے افسوس تھا تو یہی تھا کہ اُس کی اولاد میں کوئی لڑکی نہ تھی جسے وہ عطر کی دکان پر سیلز گرل (sales girl) کا کام سکھا دیتی۔ اب لڑکوں کا عطر بیچنا ایسا ہی ہے جیسے بین کے آگے بھینس کا ناچنا۔ اور وہ خود اپنی جوانی کا سرمایہ اپنے شوہر اور بچوں میں لگا چکی تھی۔ بس یہی ایک سرمایہ ہے اس دنیا میں جو سرمایہ دار کو واپس نہیں لوٹتا ہے ورنہ ہمیشہ سود سمیت واپس ہوتا ہے۔ بلونت رائے اور ماداموسوتا نے بحالت مجبوری اخبار میں سیلز گرلز کے لئے اشتہار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں بہت جلد ایک بہت اچھی لڑکی مل گئی۔

موہنی کراچی کی پیداوار تھی۔ سیدھے سبھاؤ کی معصوم لڑکی تھی۔ نہ کوئی غمزہ نہ ادا۔ دو چوٹیاں شانوں پر بکھرائے ایک سلیٹی رنگ کی ساڑھی پہنے سیدھی کالج سے انٹرویو کے لئے آ گئی تھی۔ موہنی کا باپ مر چکا تھا۔ ماں گٹھیا سے نیم اپاہج بن چکی تھی۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے، جو بالترتیب پانچویں اور ساتویں میں پڑھتے تھے۔ گھر میں سب سے بڑی وہ تھی۔ اس لئے باپ کا جوا اس کے کندھے پر آ پڑا تھا

اور وہ جیسے تیسے نباہ رہی تھی۔ صبح میں وہ کالج جاتی۔ سات سے ساڑھے دس بجے تک کالج ہارن بی روڈ کے نکڑ پر واقع تھا۔ اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کی سہولت کے لئے کھولا گیا تھا۔ دن میں دو جگہ پارٹ ٹائم ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی۔ زندگی سخت تھی حالات ناساعد آرزوئیں مجبور دل بجھا بجھا سا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے جس نے اپنے ویرانہ ہستی میں دو چار نخلستان نہ سجا رکھے ہوں۔ مگر موہنی اپنی زندگی پر جدھر نظر ڈالتی، کوسوں تک اُسے ریت ہی ریت نظر آتی۔ کہیں کوئی پھول تو کیا گھاس کی پتی بھی نظر نہ آتی تھی۔ صرف اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کبھی ایسے شفاف سائے سے لرزنے لگتے جیسے بہت دور کہیں خواب رو رہے ہوں۔ صرف ان چند لمحوں میں اس کی ہستی بے حد دل آویز ہو جاتی تھی۔ اس وقت اگر کوئی اسے دیکھتا تو پتھر سے پتھر دل پانی ہو جاتا۔ مگر بمبئی میں نہ پتھر دل ہوتا ہے نہ نرم دل ہوتا ہے۔ بمبئی میں دل کی جگہ ایک کلارک رکھا ہوتا ہے جو ہر وقت ٹک ٹک کیا کرتا ہے کلارک بڑی اچھی چیز ہے۔ بڑی کارآمد چیز ہے۔ مگر آپ کلارک سے محبت نہیں کر سکتے۔

بلونت رائے موہنی کی لسبورتی ہوئی صورت دیکھ کر اسے واپس بھیجنے والا تھا، مگر نکلنے کیلیے سوشا نے موہنی کی بھوری بھوری آنکھوں

میں وہ شفاف سے سائے تیرتے ہوئے دیکھ لئے۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے موہنی کو جاتے ہوئے روک لیا، اور اسے اپنے پاس بُلا لیا۔

سوسنا حسن کا شدید احساس رکھتی تھی۔ اس نے ایک نگاہ ہی میں موہنی کو پسند کر لیا۔ یہ لمبے لانبے سنہری ریشوں کی طرح بنی ہوئی چوٹیاں اگر کٹ جائیں اور بال پھیل کر شانوں پر بکھر جائیں تو کیا ہو؟

یہ سیدھی صف آرا پلکیں اگر ذرا گھوم کر روز سے دمکتے ہوئے رخساروں پر حجاب آمیز ادا سے گر جائیں تو کیا ہو؟

یہ پھیکا گلابی — دہن اگر شا فری کی لپ اسٹک سے آشنا ہو جائے۔ وہ لپ سٹک جو لبوں پر گھومتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہونٹ شعلوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ وہ لپ سٹک اگر ان ہونٹوں سے مس ہو جائے تو کیا ہو۔

جھاگ والے ربڑ کے نئے فیشن کی انگیا ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی — وہ بے باک اُٹھان نہیں جسے آج کل کی عورتیں فیشن کی معراج سمجھتی ہیں بلکہ وہ جھجکتی ہوئی متین سی اٹھان جیسے کنواری ایک نگاہ اُٹھائے اُوپر دیکھ لے۔

کمر کس کے اندر سے باندھی ہوئی ..... حالانکہ اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کے چھریرے لانبے بدن کی کمر یقیناً فرانسیسی عطر کی طرح

نازک ہوگی.....

نہیں، وہ اسے ساڑھی نہیں دے گی۔ وہ اسے فرانسیسی گون پہنائے گی۔ سائے اور گون اور سلیکس اور جینز اس سیلز گرل کے طرح طرح کے لباس ہوں گے۔ وہ اسے فرانسیسی عورتوں کے بہترین لباس دے گی۔ عطر کی طرح عورت کا لباس بھی بدلنا چاہئے۔ صبح میں کچھ اور سہ پہر میں کچھ اور شام میں کچھ اور.... وہ اس کے لئے کم سے کم پچیس لباس سلوائے گی۔

مادام سوسنا نے چند لمحوں ہی میں سب سوچ لیا، اور اس نے بڑے پیار سے موہنی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی

"تمہارا پرابلم (*Problem*) کیا ہے؟ تم اتنی اداس اور اجڑی اجڑی کیوں ہو؟"

فرانسیسی عورت بہترین محبوبہ ہے۔ لیکن اگر وہ ماں بننا چاہے تو اس سے بہترین ماں کا تصور کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی میٹھی شہد بھری آواز کو سن کر موہنی پگھل گئی۔ روتے روتے اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان سنا دی۔ داستان میں تھا ہی کیا۔ چند منٹ میں ختم ہو گئی

"چار سو روپے میں تمہارا کام چل جائے گا؟" سوسنا نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ایک خوشبو اڑی اڑی سی۔

"میڈم" ۔۔ موہنی حیرت اور خوشی سے تقریباً چیخ کر بولی

"سوشا!" بلونت رائے بھی حیرت سے چیخا، مگر اس کی آواز میں خوشی بالکل نہ تھی۔

"چپکے بیٹھو" مادام نے اپنے شوہر کو ڈانٹ دیا۔ "تم نہیں جانتے یہاں ہم ہندوستانی مٹھائی نہیں بیچ رہے ہیں، فرانسیسی عطر بیچ رہے ہیں۔ چار سو روپیہ مہینہ بھی اس لڑکی کے لئے بہت کم ہے۔ تم اس کا پرابلم (Problem) تو دیکھو!"

"اوجہیں" ۔۔۔ بلونت رائے کسی زمانے میں جالندھر کا مشہور پہلوان ہوا کرتا تھا۔ اس کی شہرت کا راز یہ تھا کہ بڑے سے بڑے پہلوانوں سے ٹکر لینے کے لئے راضی ہو جاتا۔ مگر ہمیشہ ہار جاتا تھا، اور جب چاروں شانے گرتا تھا، تو بڑی مایوسی سے چلّا کر اپنے آپ سے کہتا تھا ۔۔۔

"اوجہیں۔"

وہ پیرس اپنی پہلوانی کے کرتب دکھانے گیا تھا۔ مگر وہاں سوشا نے چاروں شانے چت گرا لیا۔ جب سے اس نے کشتی چھوڑ کر ہندوستانی مٹھائی بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

سوشا نے موہنی سے پوچھا "خوشبوؤں کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"میں نے آج تک کبھی کوئی خوشبو نہیں لگائی" موہنی نے ڈرتے ڈرتے اقبالِ جرم کیا۔

سوشنا بے حد خوش ہو کر بولی "تب تو بہت اچھا ہے۔ بہت جلدی سیکھ جاؤ گی۔ بڈھے طوطے کو پڑھانا بہت مشکل ہوتا ہے"

"او جیسس" بلونت رائے پھر بڑی مایوسی سے بولا۔ اُسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب تک اُس نے جو کچھ ہندوستانی مٹھائی سے کمایا ہے اب وہ سب فرانسیسی عطر میں غارت ہو گا۔

"شٹ اپ" سوشنا اُسے دھمکاتے ہوئے بولی۔

بلونت رائے فوراً شٹ اپ ہو گیا۔

"میں دو ماہ کے لئے تم کو گھر پر ٹریننگ دوں گی" سوشنا موہنی سے بولی "دو ماہ کے بعد تم دکان پر کام کرنے لگو گی۔ دکان پر پہننے کے لئے کپڑے ہم دیں گے۔ لنچ کا خرچ ہمارا ہو گا۔ دکان بند ہوتے ہی تم شام کے اسی لباس میں میرے گھر پر آؤ گی۔ اور یہاں سے اپنا لباس تبدیل کر کے اپنے گھر جایا کرو گی۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"کھوکھرا بلڈنگ، آٹھ نمبر کی کھولی، ناگپاڑہ۔"

سوشنا نے اس کا اڈریس لکھ لیا۔

ناگپاڑے کا نام سنتے ہی بلونت رائے کو ایسا محسوس ہوا جیسے

ایک خوشبو اڑی اڑی سی

بہت سی بدبوئیں اس کی ناک میں گھس آئی ہوں۔ مگر وہ چپ رہا کیونکہ اُسے اُس کی بیوی نے شٹ اپ کر دیا تھا۔ اور وہ ایک وفادار خاوند تھا۔

سوسنا نے موہنی کے ہاتھ میں اپنا کارڈ دے کر کہا۔

"یہ ہمارے گھر کا پتہ ہے۔"

موہنی نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی۔

"گیارہ نمبر وارڈن روڈ۔"

اور پھر اس کارڈ کو اپنی انگیا میں ڈال کر چلی گئی۔

دو ماہ بعد جب چرچ گیٹ کے نکڑ پر روزا بینڈ روزا بینڈ روز کمپنی کی بغل میں فرینچ پرفیومز لمیٹڈ کی دکان کھلی، تو سارے علاقے میں فرانسیسی خوشبوؤں کی دھوم مچ گئی۔ کولابے سے، کف پریڈ سے، میرین ڈرائیو سے، وارڈن روڈ سے، کمبالا ہل سے جوق جوق لوگ فرانسیسی عطر خریدنے کے لئے آنے لگے۔ بعض من چلے تو دن میں دو دو مرتبہ عطر خریدنے کے لئے جاتے تھے۔

اور موہنی —

موہنی کو اب کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ وہی کمرشیل کالج میں پڑھنے والی بجھی بجھی سی سندھی لڑکی ہے۔ موہنی کے چمکتے ہوئے سنہرے بال، تارِ عنکبوت کی طرح تاباں، اس کے شعلے کی طرح بھڑکتے ہوئے ہونٹ، اور ان ہونٹوں کے اندر بے حد سپید اور متناسب دانت۔ اس کی بھوری بھوری شفاف چمکتی ہوئی آنکھیں، وہ چال ہندوستانی عورت کا سارا وقار لئے ہوئے، وہ آواز فرانسیسی عورت کا سارا اعتماد لئے ہوئے اُس کے فرینچ گاؤن، اس کے خوب صورت پرس، اس کے اردگرد کپھاوں کی طرح لپٹی ہوئی عطر بیز مہک، متمول ترین علاقوں کی نیشن ایبل عورتیں، اُس کے گاؤن دیکھنے آتی تھیں، آج اس نے کونسا گاؤن پہن رکھا ہے؟ کون سا پرس سنبھالے ہوئے ہے؟ کون سی خوشبو لگا رکھی ہے؟ میک اَپ کا انداز کیا ہے؟ عورتیں اسے دیکھ کر پاگل ہونے لگیں اور مرد پاگل ہو کر اُسے دیکھتے۔

اور موہنی کی زبان کیا چلتی تھی۔ وہ کم گو متین ہندوستانی لڑکی اب ایک لمحہ چپ نہ رہتی۔ کیوں کہ اسے مادام نے بتا دیا تھا کہ چُپ رہیں تو تمہاری باتوں کی ساری خوشبو اڑ جائے گی۔ عطر بیچنا ہے تو گاہک کو ہر لحظہ باتوں میں الجھائے رکھو۔ ایک کے بعد دوسرا عطر پیش کرتی جاؤ۔ عورتیں

پچاس عطروں میں ایک عطر انتخاب کرتی ہیں ۔ مردوں کے لئے اپنا سارا زور صرف ایک عطر بیچنے میں لگا دو۔

جب ورشن نے اُسے دیکھا، تو وہ کونٹر پر مؤدب کھڑی ہائی سوسائٹی کی مشہور سوشلائٹ مس خورشید ابٹن والا کے سامنے عطر کی مختلف شیشیاں رکھے اُس سے گفتگو میں مصروف تھی ۔

خوشبو کا راز اس بات میں ہے مس ابٹن والا کہ صحیح خوشبو خریدی جائے ، اور وہ خوشبو خریدی جائے جس کی شخصیت خریدنے والی کی خوشبو سے مطابقت رکھتی ہو ۔

"خوشبو کی بھی شخصیت ہوتی ہے ! مونی ، " خورشید ابٹن والا ہنس کر بولیں ۔

"ہاں مس ابٹن والا ۔ ہر خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے اپنی ایک صورت ہوتی ہے ۔ اس کا قد ہوتا ہے ۔ رنگ ہوتا ہے ۔ اب مثال کے طور پر گلاب کے عطر کو لے لو ۔ گلاب کی خوشبو کے ہونٹ .... ذرا سونگھ کر دیکھئے گا .... اس گلاب کی خوشبو کے ہونٹ کیسے سرخ اور گلاب سے بھرپور .... بالکل آپ کے ہونٹوں کی طرح .... ہر وقت کسی نامعلوم جذبے سے تھرتھراتے ہوئے .... "

مس خورشید ابٹن والا بے اختیار خوش ہو کر ہنسیں ۔

"یہ چنبیلی کی خوشبو دیکھئے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کیسی کم عمر نوخیز چھریرے بدن والی، نازک کمر والی خوشبو ہے۔ اپنے مستانہ خرام سے دلوں پر بجلیاں گرائے چلی جاتی ہے۔"

"یہ پیرس کی رات، دراز قد، سیاہ گیسو پھیلائے ہوئے اپنے نرم گال آپ کے گالوں سے یوں لگا دیتی ہے کہ گال اور گیسو کے لمس سے آپ کے جسم میں گدگدیوں کے بلبلے سے پھوٹنے لگتے ہیں۔

یہ جوہی کی کنواری خوشبو۔ پاکیزہ سمٹی سمٹائی، چور نگاہوں سے آپ کے دل پر حملہ کرتی ہوئی کبھی ایک قدم آگے بڑھتی ہوئی کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی۔ اس کی مہک ایک شرمیلی دوشیزہ کی طرح پرحجاب نظر آتی ہے۔

یہ سنگھم راج کی خوشبو: گوری گوری رنگت والی نکھری نکھری چمکیلی اور روشن خوشبو، بالکل آپ کے چہرے کی طرح مس ابٹن والا۔ اسے نہا کر ذرا سا جسم پر لگا دیجئے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا اوشا بادلوں کے جھاگ سے ڈھل کر باہر نکل آئی ہے۔

نہ صرف یہ کہ خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا اپنا ایک لباس بھی ہوتا ہے، جو احساس میں کبھی تو ریشم کی طرح سرسراتا ہے کبھی ململ کی طرح پھسلتا ہے کبھی شفان کی طرح لپٹتا جاتا ہے اسی

لئے میڈم دنیا میں جو بھی سلیقہ شعار عورتیں ہیں، ہمیشہ کسی عمدہ خوشبو کا سہارا لیتی ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ لباس کے حسن کی طرح خوشبو کا حسن بھی مستعار لے لیتے ہیں

چند لمحوں کے لئے خوشبو کا حسن عورت کے حسن پر چھا جاتا ہے۔ اور مرد سمجھتا ہے کہ عورت حسین ہے۔ حالانکہ صرف خوشبو حسین ہے"

یہ آخری چوٹ مادام سوشا نے خاص طور پر موہنا کو رٹائی تھی عورتیں بڑی برخود غلط ہوتی ہیں۔ ان کے حسن کی تعریف کرو، ضرور کرو، وہ اس سے خوش ہوتی ہیں۔ مگر کہیں ان کے اندر ایک لمحے کے لئے احساس کمتری بھی پیدا کرو کہ جس کی چوٹ کھا کر وہ تمہارے عطر کو اپنے حسن کے لئے ضروری خیال کریں، ورنہ وہ تمہارا عطر کیوں خریدیں گے عورت پریکٹیکل ہوتی ہے۔ موہنی!

مس ابٹن والا وہ خوشبو خرید کر لے گئی۔ روز جس کے ہونٹ موہنی کے الفاظ میں مس ابٹن والا کے ہونٹوں سے مشابہت رکھتے تھے، (حالانکہ نہیں رکھتے تھے) اور شگھد راج ..... جس کی رنگت خورشید ابٹن والا کی رنگت سے ملتی جلتی تھی۔ ایک سو ستر روپے کا بل ہوا۔ حالانکہ بھنڈی بازار والے عطر فروش یہی دونوں خوشبوئیں دس پندرہ روپے میں دے دیتے۔ مگر وہ بھی کم بخت کیا عطر بیچتے تھے۔

لوہے کی ایک پتلی سی سلائی پر روئی کے پھاہے میں عطر لگا کر بیچتے تھے جیسے وہ عطر نہ بیچ رہے ہوں، کانوں سے میل نکال رہے ہوں۔

یہاں موہنی کی نازک نازک لانبی لانبی انگلیاں عطر لگاتی تھیں، درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کے وائلن کے سارے تار چھیڑ دیئے۔ وہ موہنی کو بھونچکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور جب سوٹ بوٹ والا کے چلے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"فرمایئے۔ آپ کو کون سا عطر چاہیے؟"

تو وہ بے حد گڑبڑا گیا۔ وہ تو محض اسے دیکھنے کے لئے دکان کے اندر آ گیا تھا۔ بے اختیار اس کے مدہوش کر دینے والے حسن سے کھنچا ہوا اندر آ گیا تھا۔ اب یہ لڑکی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔

وہ بے حد گڑبڑا کر بولا۔

"جی!" جیسے اسے کچھ نہ خریدنا ہو۔ خریدنا موہنی کو ہو۔

"کوئی عطر دکھاؤں یا روڈی کلون؟ ہم نے پیرس سے نئے روڈی کلون منگائے ہیں۔ یہ سپین کی وادیوں کے پھولوں کے اصلی روڈی کلون ہیں۔ یہ صبح کے وقت نہا دھو کر استعمال کرنے والا روڈی کلون..... یہ دوپہر کی گرمی کی تمازت دور کرنے والا روڈی کلون.... یہ کام سے فارغ ہو کر چہل قدمی کے لئے جانے سے پہلے استعمال کرنے والا ــــ

روڈی کلون .... یہ رات کے ڈانس میں جانے سے پہلے برتنے والا روڈی کلون .... مکمل سیٹ ایک سو گیارہ روپے کا ہے .... سپین کی وادیوں میں مہکنے والے پھولوں کا اصلی روڈی کلون ...."

"جی .... جی .... مجھے کچھ نہیں چاہیئے" درشن نے شرما کر کہا، اور اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

"میں تو صرف آپ کو دیکھنے کے لئے آیا تھا .... دفتر میں بہت لوگوں نے ...."

موہنی نے حجاب آمیز نگاہوں سے اپنی پلکیں جھکا لیں۔ بالکل اس طرح جس طرح اس موقع کے لئے مادام نے بتایا تھا۔ دوسری بار جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو درشن وہاں سے جا چکا تھا۔ موہنی کے دل کو ایک عجیب دھچکا سا لگا۔ مرد تو بہت آتے تھے دکان پر مگر ان میں سے بیشتر بے ایمان تھے۔ آتے تھے اسے دیکھنے کے لئے۔ لے کے جاتے تھے عطر اور خوشبو، اور روڈی کلون۔ ہیئر آئل، شمپو اور کریم ... مگر یہ کیسا لڑکا تھا، شرما بھی گیا، اور بے جھجک سب کچھ کہہ بھی گیا۔ پھر کچھ خرید کے بھی نہ لے گیا۔ شاید وہ کچھ خریدنے نہ آیا تھا کچھ دینے آیا تھا۔ شام تک موہنی کو اپنا دل کچھ خالی خالی سا لگنے لگا۔ جیسے اس کی ساری دکان لوٹی جا چکی ہے۔ کسی نے اس کے دل کے

دریچے میں جھانا۔ کہ وہاں کے سارے عطر چرائے ہیں۔

اونہہ! موہنی نے اپنے سر کے بالوں کو جھٹک دیا۔ اسے اس طرح کی باتیں نہیں سوچنا چاہیئے۔ مادام نے اُسے خبردار کر دیا تھا۔ سب کچھ ہوگا مگر عشق نہیں ہوگا۔ لوگ تمہیں گھومنے کے لئے بلائیں گے۔ مگر تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ لوگ تمہیں پارٹیوں میں مدعو کریں گے۔ چائے کی دعوت دیں گے۔ اک ذرا دو منٹ کے لئے تخلیہ چاہیں گے۔ مگر تم ہمیشہ انکار کر دو گی۔ کیوں کہ تم عطر بیچنے والی ہو۔ عطر اور محبت میں یہی فرق ہے۔ عطر ذرا سی دیر کے لئے مہکتا ہے، پھر اڑ جاتا ہے۔ محبت اگر ساتھ لپٹ جائے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اگر عطر بیچنا چاہتی ہو تو اس چکر میں مت پڑنا......

شام کے ساڑھے چھ بجے مادام سوشا کی گاڑی اسے لینے کے لئے دکان کے باہر آ پہونچی۔ پہلے تو موہنی نے اندر جا کے باتھ روم میں اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ بالوں کو سنوارا۔ شام کا خوب صورت لباس پہنا۔ یہ لباس پہننا بے حد ضروری تھا۔ کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ باہر شوقین مزاج نوجوانوں اور رئیس زادوں کی لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوں گی۔۔۔ سب اسے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت اُسے دکان سے ایک پُراسرار شہزادی کی طرح حسین اور دور افتادہ بن کر نکلنا

ہوگا۔ وہ بڑی تمکنت سے باتھ روم سے باہر نکلی۔ بلونت رائے کو اس نے سر کی جنبش سے سلام کیا ۔ اور پھر پرس جھلاتی ہوئی باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے سلوٹ مار کر اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ تماشائیوں کی نظریں اس پر گڑ گئیں۔ کچھ سیٹیاں بجیں، کچھ ہائے وائے ہوئی، کچھ چنگاریاں لپکیں، کچھ آہیں بھڑکیں، پھر گاڑی وارڈن روڈ کی جانب چلی گئی ..... !

بھیڑ میں درشن بھی کہیں چھپا کھڑا تھا۔ موہنی کو اس لباس فاخرہ میں نکلتے دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کیسی غلطی کی اس نے جو وہ اس سیلز گرل کو دل دے بیٹھا۔ یہ تو جانے مالابار ہل یا وارڈن روڈ کی کوئی شہزادی ہے، جو کار میں بیٹھ کے آتی ہے۔ کار میں جاتی ہے جس کے گاؤن پیرس سے سل کر آتے ہیں۔ جس کے بال "تاج" میں ڈھلتے ہیں اور جس کا جسم نیویارک کے میک اپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس نے تو شاید شغل کے طور پر عطر بیچنے کا کام اختیار کر لیا ہے۔ آج کل کی متمول گھرانوں کی عورتوں نے بھی کام کرنے کو بطور ایک فیشن اختیار کر لیا ہے۔ اسے بھول جا الّو۔ آرام سے اپنی فرم میں ڈھائی سو روپے کی ملازمت کرتا جا۔ اور اگر عشق کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ تیرے دفتر میں مس ڈی سوزا کیا بُری ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار لیتی ہے،

بار بار زہری میز پر آکر جھک جاتی ہے اور اپنا نیم عریاں سینہ دکھا کر چلی جاتی ہے۔ شفان کا خیال چھوڑ دے، اپنی کاٹن کی کھال میں مست رہ ــــ!

مگر درشن سے رہا نہیں گیا۔ دوسرے دن وہ پھر فرنچ پرفیومز کی دکان پر گیا۔ تیسرے دن بھی گیا۔ چوتھے دن بھی گیا۔ پانچویں دن بھی گیا۔ ہر روز وہ شیو کرنے کے بعد استعمال کرنے والی روڈی کلون دس روپے میں خرید لیتا تھا۔ اور کچھ نہیں کہتا تھا ــــ بس وہی ایک روڈی کلون خریدتا، اور خرید کر باہر چلا آتا .... نہ وہ مسکراتا تھا نہ کوئی بات کرتا تھا۔

چھٹے دن موہنی نے کہا ــ" روڈی کلون کی کتنی شیشیاں خریدو گے؟"

"پچیس"

"پچیس کیوں؟"

"بات یہ ہے" درشن نے اُسے نہایت سادگی سے سمجھاتے ہوئے کہا" میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے۔ میں اس تنخواہ سے روڈی کلون کی صرف پچیس شیشیاں خرید سکتا ہوں۔ اس لئے ہر روز میں ایک شیشی خریدنے کے لئے جاتا ہوں۔ پچیس دن تک خریدتا رہوں گا۔ پھر باقی پانچ دن

تمہیں آواز لگا کر پھر یکم کو آؤں گا اور یکم سے پہلے تک آتا رہوں گا ۔۔۔ !

" کتنے سال کا پلان ہے ؟ " موہنی نے شوخی سے پوچھا ۔

" کہہ نہیں سکتا ۔ جب تک جیب ساتھ دے یا قرضہ ملتا رہے یا کوئی دوسرا پارٹ ٹائم جاب ملتا رہے ۔"

جب تین مہینے اسی طرح گزر گئے تو موہنی کو سخت وحشت سی ہونے لگی ۔

" مگر یہ تو سخت حماقت ہے مسٹر ! "

" درشن میرا نام ہے ۔" درشن بولا ۔" میں جانتا ہوں یہ ایک حماقت ہے ۔ کہاں تم وارڈن روڈ پر رہنے والی شہزادی ، کہاں میں ایک معمولی فرم میں کام کرنے والا کلرک ۔۔ تمہارا خیال ہے میں جانتا نہیں ہوں ۔ میں کیا کر رہا ہوں ۔ مجھے بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے ۔ راتوں کو چار چار گھنٹے ایکسٹرا ٹائپ کرنا پڑتا ہے ۔ انگلیاں دکھ جاتی ہیں مگر ۔۔"

یکایک وہ چپ ہو گیا ۔

موہنی کا دل دھڑکنے لگا ۔ آہستہ سے بولی ۔

" مگر کیا ؟ "

" کچھ نہیں ۔ ذرا وہ میری روڈی کلون دے دو ۔"

روڈی کلون لینے موہنی مڑ رہی تھی کہ اتنے میں ایک گھوڑے

ایک خوشبو اڑی اڑی سی

کے چہرے اور گھوڑے کے سے دانتوں والی ایک انگریز عورت بڑی گھبرائی ہوئی سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے داخل ہوئی۔

موہنی فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"مجھے خوشبو چاہیے۔"

"کیسی مادام؟"

"کیسی بھی دے دو۔ کوئی اچھی سی خوشبو۔ میں نے سنا ہے تمہاری دکان سے بہتر خوشبو بمبئی میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ اس لئے میں نے سوچا: اس مصیبت میں تمہارے سوا اور کس کے پاس جاؤں؟"

"تھینک یو مادام .... تھینک یو .... مجھے آپ کی مصیبت میں آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ اور آپ کا یہ ماتمی لباس دیکھ کر میں خود سوزش میں پڑ گئی ہوں کہ آپ کو کون سی خوشبو دوں —— شاید آپ کا کوئی عزیز ..... "

"عزیز نہیں، گھوڑا مارکہ" — انگریز عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی "میری زندگی کا سب سے عزیز، سب سے چہیتا، سب سے پیارا مجھے داغِ مفارقت دے گیا ہے میرا ٹونی۔"

"ٹونی؛ آپ کا شوہر؟"

"گوڈ ہیونس Good heavens نو ٹونی میرا کتا...."

" اوہ معاف کرنا مادام ..... مجھ سے بھول ہوئی ۔ دراصل اتنے سوال کرنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ماتمی خوشبوئیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں ۔ محبوب کے مرنے پر ایک خوشبو لگائی جاتی ہے ۔ کتے کے مرنے پر دوسری ۔ شوہر کے مرنے پر تیسری ۔ بچے کے مرنے پر چوتھی ہمارے ہاں ماتمی خوشبوؤں کی الگ الگ قسمیں ہیں ۔ آپ ... یہ خوشبو لے جائیے ۔ سٹونی ہارٹ !"

"سٹونی ہارٹ ؟"

"جی ہاں دیکھئے ، اور اس کا نام بھی کس قدر آپ کے کتے سے ملتا جلتا ہے ۔ ٹونی ہارٹ اور سٹونی ہارٹ میں کس قدر کم فرق ہے ؟ معلوم ہوتا ہے ۔ یہ خوشبو صرف آپ کے کتے کے ماتم کے لئے بنائی گئی ہے ...."

"سٹونی ہارٹ ! واقعی " انگریز عورت پرس کھولتے ہوئے بولی ۔ " واقعی وہ پتھر دل کتا تھا ۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا "

انگریز عورت کے لہجے میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارا تھا ۔ پرس کھول کر بولی ——

"کتنے پیسے ہوں گے ؟"

"صرف ساٹھ روپے " موہنی نے بڑی عاجزی سے کہا ۔

"صرف ساٹھ روپلے"۔ انگریز عورت ذرا آخبتس ہو کر بولی ۔ پھر خود ہی لہجہ بدل کر بولی ـــــ "مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ خوشبو بہت عمدہ ہے ۔ بوجھل .... بوجھل ، اُداس سی اور کچھ کھُردری سی خوشبو ، بالکل میرے اڈونی کے بھورے اور خشک بالوں کی طرح ... میں اسی کو لے جاؤں گی ۔ اس سے مجھے اپنا ٹونی یاد آئے گا ـــــ تھینک یُو ویری مچ !"

ساٹھ روپلے دے کر جیسے انگریز عورت چلی گئی ، تو موہنی نے معافی مانگتے ہوئے درشن کو یوڈی کلون کی نئی شیشی لادی ۔

"ساری ، آپ کو انتظار کرنا پڑا "

" نہیں ... بلکہ مجھے تو زیادہ وقت مل گیا "

موہنی خاموش کھڑی رہی ......

چلتے چلتے درشن نے کہا "گوڈبائی سوئٹی ہارٹ !" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے .....

موہنی کا دل لرزنے لگا ....

نہیں نہیں ۔ میں عشق تو کر ہی نہیں سکتی ..... مجھے کوئی حق بھی نہیں ہے ۔ اتنی اچھی چار سو کی نوکری مجھے کہاں ملے گی ـــ ان چار سو روپیوں میں میری ماں کا علاج ہو رہا ہے ۔ میں اپنی اندھی خالہ

کو پیسے بھیج دیتی ہوں۔ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم انگریزی سکول میں پوری ہو سکتی ہے۔ مجھے یوں ہی رہنا ہے..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر درشن بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ہوتا۔ جو اُسے دیکھنے کے لئے دکان میں آتے تھے، اور اُس سے طرح طرح کا مذاق کرتے تھے۔ شستہ مذاق، مخمل میں لپٹے ہوئے مذاق، مگر ایسے مذاق جن کے اندر غلیظ خواہش کی تیز چھری چھپی رہتی تھی۔ جس کی دھار کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے عیاں بھی ہو جاتی تھی ـــــ امیر طبقے کے شہزادے، ملوں کے ہونے والے مالک، ٹھیکے داروں کے سپوت، رشوت لینے والے افسروں کے صاحبزادے، گلیمر کے بارے میں دمکتے ہوئے ماہتاب کی طرح خوب صورت فلمی ہیرو، جو ایک رات میں بیس ہزار پھونک سکتے تھے۔ وہ سب اس کی ایک نگاہِ ناز کے متمنی تھے، مگر صرف ایک نگاہِ ناز کے، وہ کوئی عمر بھر کا پیمان باندھنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ صرف اک نگاہِ ناز خریدنے آتے تھے، جیسے وہ عطر خریدنے آتے تھے۔ اور عورت کی آب بھی اس وقت تک ہے جب تک وہ اپنی عزت کی شیشی میں محفوظ ہے۔ عطر کی شیشی کھلی اور آب غائب، یہ مردوں کی دنیا ہے۔ اس میں عورت اور عطر ہمیشہ بدلے جاتے ہیں مادام نے اسی طرح اُسے سمجھایا تھا۔

مگر پھر بھی درشن اسے اس طرح نہیں لگتا۔ کوئی اس کے دل کے اندر بولتا تھا، اور کہتا تھا۔ یہ تو ایسا نہیں ہے۔ وہ تو کچھ کہتا بھی نہیں ہے۔ کوئی مخمل میں لپٹا ہوا گندہ مذاق نہیں کرتا ـــــ اُس کی آنکھوں میں کیسی شرافت ہے، کیسی وارفتگی ہے۔ دل وجاں سے چاہنے کی کیسی آرزو ہے۔ اُس کے پریشان بالوں کی لٹ اسے اس قدر پیاری کیوں معلوم ہوتی ہے؟ کیوں اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنے سینے سے لپٹا لے! دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر آنکھیں بند کر کے اُسے اپنی چھاتی سے لگا لے! ہائے یہ کیسی کاہش ہے جو میری جان کو کھائے جاتی ہے ..... مگر.... نہیں.... نہیں .... مجھے اس طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ تو مجھے آسمانوں پر اڑنے والی شہزادی سمجھتا ہے۔ میں اس کا سندر سپنا کیوں چور چور کر دوں۔ اُس نے تو مجھے ہمیشہ فرانسیسی گاؤن میں دیکھا ہے ــ خوشبوؤں میں لپٹا ہوا۔ زرکار پرس جھلاتے ہوئے مادام کی گاڑی میں دیکھا ہے۔ اسے کیا معلوم میں ایک بدبخت لڑکی ہوں، ناگپاڑے کی ایک گندی چالی میں، ایک بدبودار کوٹھری میں اپنے دو بچوں اور گٹھیا کی ماری ہوئی ماں کے ساتھ رہنے والی، جسے ہر ماہ سو روپیہ اپنی اندھی خالہ کو بھیجنا پڑتا ہے۔ اگر اسے حقیقت معلوم ہو جائے تو

کیا وہ مجھ سے پریم کر سکے گا؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ اچھا ہے، یہ دھوکا یُوں ہی رہے۔ مگر اس کا اس طرح سے آ کر اپنے آپ کو لٹانا تو مجھے اچھا نہیں لگتا، بالکل غلط ہے، بالکل غلط ہے۔ اگر میں اس سے پریم نہیں کر سکتی، تو مجھے اسے برباد بھی تو نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے اس سے سرد مہری کا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایسا سلوک جس سے اس کے دل میں میرے لئے نفرت کی آگ بھڑک اُٹھے ــــ وہ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے ــــ مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائے اور اگر یاد بھی کرے تو ایک بُری، ناکارہ، بدمعاش آوارہ لڑکی کی طرح ......

جس دن موہنی نے یہ فیصلہ کیا کہ اُس دن وہ بے حد اداس اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اور مادام نے اس کے زرد زرد اُڑے اڑے چہرے کی رنگت کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ بھی کیا، مگر موہنی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ــــ

'اُسے آج بہت کام کرنا پڑا ہے۔ گاہکی بہت زیادہ تھی، اور وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔

گاؤن اُتار کے اس نے اپنی سادہ ہینڈلوم کی ساڑھی پہن لی اور پُرانے سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی موہنی وارڈن روڈ کے عالی شان فلیٹ سے اتر کر ایک بس میں سوار ہو کر ناگپاڑے چلی گئی۔

موہنی کے پلان کا شروع میں تو خاطرخواہ اثر نہ ہوا۔ درشن بھی بے حد ڈھیٹ تھا۔ مگر موہنی نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی ڈھٹائی کا جواب مکمل ڈھٹائی سے دے گی۔ یہ قصہ اس کی ہمت کو چوپٹ کر رہا تھا اس کے کام میں حارج ہو رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند حرام کر رہا تھا۔ اب اس قصے کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ جب قصے کا کوئی خاطرخواہ انجام نظر میں نہ ہو، اُسے ڈھیل دینے سے کیا فائدہ؟

اب درشن کو دیکھتے ہی موہنی تیوری سی چڑھا لیتی وہ اس کے لئے یوڈی کلون کی شیشی بل کاٹ کے الگ سے تیار رکھتی۔ درشن آتا موہنی اس کے ہاتھ میں بل اور شیشی تھما دیتی، اور تھینک یو کہہ کے دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ اس پر بھی درشن باقاعدگی سے آتا رہا۔ وہ کچھ بجھ سا گیا تھا، مگر پھر بھی آتا رہا۔

خیر ایک دن موہنی کو آخری حملہ کرنے کا موقع مل ہی گیا اور موقعے کی وہ تلاش میں ہی تھی۔ اس روز گروپ کیپٹن لال کاکا اس کے قریب کھڑا اس سے عطریات کے فن پر بحث کر رہا تھا۔ گروپ کیپٹن کاکا۔ دوسری جنگ عظیم کا نامور ہوا باز تھا۔ وہ آرمی سے ریٹائر ہو چکا تھا،

اور ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ چالیس برس کی عمر میں بھی وہ بڑی مشکل سے تیس کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا گورا رنگ، جیسا کہ پاربیوں کا عموماً ہوتا ہے۔ اُس کے گھومے ہوئے بال، مضبوط ٹھوڑی، اور چھوٹی چھوٹی پُر وقار مونچھیں اس کے چہرے کو عجیب وجاہت عطا کرتی تھیں۔ وہ بڑا بانکا اور سجیلا تھا۔ اور ہائی سوسائٹی کی خوب صورت لڑکیوں میں قاتل کے نام سے مشہور تھا۔ لڑکیاں تو اُس کے ذرا سے لنگڑانے پر بھی جان دیتی تھیں۔ بولتے بولتے اس کی زبان میں کبھی وقت جو ذرا سی لکنت پیدا ہوتی تھی، اُسے بھی لڑکیاں بے حد پسند کرتی تھیں۔ گروپ کیپٹن لال کاکا چار سال پیرس میں رہ چکا تھا۔ اس لئے اُسے فرانسیسی عطریات سے بڑی دلچسپی تھی —— کیوں کہ فرانسیسی لڑکیوں کے نفسیات میں عطر کو بہت دخل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سمجھ دار نوجوان کے لئے جو عورتوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اُس کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ عطر کے بارے میں بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہو۔

گروپ کیپٹن لال کاکا اکثر فرنچ پرفیومرز سے عطر خریدنے آیا کرتا تھا، اور موہنی سے باتیں کرنے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ موہنی سے باتیں کر رہا تھا۔ جب درشن دکان کے اندر

ایک خوشبو اڑی، اڑی سی

داخل ہوا۔ موہنی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ گروپ کیپٹن لال کاکا سے باتیں کرتی رہی۔

موہنی ہنس کر بولی "کیپٹن لال کاکا ..... عطر کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ ایک ماحول ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں نہ وقت دیکھتے ہیں نہ ماحول کا خیال کرتے ہیں"

درشن کا رنگ فق ہو گیا۔

گروپ کیپٹن لال کاکا نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مثال کے طور پر میں نے اس وقت جو خوشبو لگا رکھی ہے۔ اس کے متعلق تم کیا کہو گی؟"

موہنی گروپ کیپٹن کے سینے کی طرف جھکی ــــ اور جھکی ــــ اُس کے بال گروپ کیپٹن کی ٹھوڑیوں سے چھو گئے ــــ درشن کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے اُس کے کلیجے میں چھری بھونک دی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"میں تمہیں اس عطر کا نام تک بتا سکتی ہوں، اور یہ بھی بتا سکتی ہوں۔ کب تم نے اسے لگایا تھا؟"

"کب؟"

"تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہیں"

"درُست!"

"اِس عطر کا نام آخری بوسہ ہے۔"

گروپ کیپٹن ہنسا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ مگر....." لہجہ بدل کر دھیرے سے بولا ..... "ابھی تو میں پہلے بوسے کی امید میں ہوں۔"

"لالی ــــ؟" موہنی بڑے پیار سے اور بناوٹی غصے سے گروپ کیپٹن لال کاکا کو جھڑک کر بولی۔

مگر درشن کو اس میں نہ بناوٹ دکھائی دی نہ غصّہ۔ اسے صرف پیار ہی پیار نظر آیا ــــ کیسی دمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی موہنی کی ــــ کس پیار سے وہ گروپ کیپٹن لال کاکا کو دیکھ رہی تھی۔ اور اُس نے اُسے "لالی" کہا تھا۔

موہنی بولی ــــ "یہ بیڈ روم کا عطر ہے، اسے لگا کر باہر نہیں گھوما کرتے۔"

"کیوں نہیں گھوم سکتے؟" گروپ کیپٹن نے پوچھا۔

"اگر تم بیڈ روم کا پاجامہ سوٹ پہن کر باہر گھوم سکتے ہو، تو ضرور اس عطر کو لگا کر بھی باہر گھوم سکتے ہو۔ اگر تم پیرس میں ہوتے، تو لوگ یقیناً تمہارا مذاق اڑاتے۔"

"تو مجھے اس وقت کون سا عطر لگانا چاہیئے؟"

"مس — ؟" درشن ذرا بے چینی سے بولا۔
"پلیز" موہنی نے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا۔
اور پھر مسکرا کر لال سے باتیں کرنے لگی۔
"بتاؤ نا۔ موہنی! ...... میں اس وقت ایک ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں، اور ہو سکتا ہے کہ بیڈ روم میں بھی جانا پڑ جائے....."
"بے حد شریر ہو!" موہنی پھر بناوٹی غصہ سے بولی۔
"میں تم کو ایک ایسا عطر دیتی ہوں جو ڈرائنگ روم اور بیڈ روم دونوں جگہ کام آسکتا ہے"
موہنی عطر تلاش کرنے لگی۔ گروپ کیپٹن بلند آواز میں بولا "تم نے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ مگر اب میں انکار کا ایک لفظ نہیں سنوں گا۔ کل میری سالگرہ ہے تمہیں پارٹی میں آنا ہوگا"
"اگر تم مجھے لینے آؤ گے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی"
گروپ کیپٹن لال کا کا نے زور سے پر مسرت سیٹی بجائی۔
درشن جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔
موہنی نے کنکھیوں سے اسے باہر جاتا ہوا دیکھا۔
جب وہ عطر لے کر واپس آئی تو گروپ کیپٹن نے چلا کر کہا۔ "تمہارے چہرے کو کیا ہوا۔ اس قدر زرد۔ پیلا...."

ایک خوشبو اڑی اڑی سی

موہنی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —

"مجھے چکر آ رہا ہے!"

اس کے بعد دو ماہ تک درشن کی صورت دکھائی نہیں دی، نہ وہ دکان پر آیا۔ نہ باہر کی بھیڑ میں کبھی دکھائی دیا۔ جہاں سے موہنی کے دل میں ایک جھرنا سا پھوٹا تھا۔ وہاں پر موہنی نے ایک بڑی سی پتھر کی سل رکھ دی۔ اندر سے زخم رستا رہے — رستا رہے — باہر سے کچھ نظر نہ آئے۔ البتہ راتوں کو اسے بھی اُسے نیند نہ آتی تھی۔ اسے سلیپنگ پلز لینے کی عادت پڑ گئی۔ محبوب کو واپس بُلانے کی دوا تو کسی ڈاکٹر نے ایجاد نہیں کی، لیکن نیند کو تو دوا کے زور پر بُلایا جا سکتا ہے۔ یہی غنیمت ہے!

ایک روز وہ آیا۔ وہ بے حد دُبلا ہو گیا تھا۔ کم سے کم موہنی نے درشن کو اس قدر بیمار اور دُبلا کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کے کپڑے بھی اچھے نہ تھے۔ پتلون میں کریز نہ تھی۔ قمیص کے دو بٹن غائب تھے — آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے نہیں سویا ہے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔

مگر نہ جانے کیوں، درشن کو دیکھ کر موہنی کا دل اندر سے پگھلنے لگا۔ اُسے اس کی بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ بے حد دل کش معلوم ہوا، مگر وہ چپ سی حیران کھڑی کی کھڑی اُسے دیکھتی رہ گئی۔

درشن نے کہا "مجھے سٹونی ہارٹ کی ایک شیشی دے دو۔"

موہنی بولی "کیا تمہارے ہاں کسی کی موت ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ میری شادی ہونے والی ہے!"

موہنی کا دل ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ رُک کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اُس کے قابو میں نہ تھے — اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کس سے کہے۔ کیوں کر کہے — بڑی مشکل سے اُس نے اپنے آپ پر قابو پا کر چہرے پر ایک مصنوعی تبسّم لا کر کہا —

"سٹونی ہارٹ تو ماتمی خوشبو ہے۔ شادی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کیا آپ — آپ کی شادی ہو رہی ہے؟"

"میرے گاؤں میں میرے باپ کر رہے ہیں۔ میں نے 'ہاں' کر دی ہے۔ آج رات کو جا رہا ہوں" — درشن رُک کر بولا۔ اُس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں آپ کو ایک بہت عمدہ خوشبو..... آپ کی دُلہن کے لئے

دوں گی ..... جائے! .... Joy ..... مسرت .... اپنی طرف سے تحفہ میں دوں گی ......"

درشن نے کوئی جواب دیئے بغیر سٹونی ہارٹ عطر کے دام کونٹر پہ رکھ دیئے۔ موہنی کے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اُس نے سٹونی ہارٹ کی شیشی اٹھا کر درشن کو دے دی۔ درشن نے شیشی اس طرح سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی، جیسے موہنی سے اپنے جرم کی آخری سزا پا رہا ہو۔ شیشی لے کر وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے باہر جانے لگا۔

"مت جاؤ درشن" ــــ موہنی نے اپنے دل ہی دل میں کہا ــــ "اندھے بے وقوف احمق! کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں؟ کیا تم صرف میرا فرنچ گاؤن دیکھتے ہو۔ میرا امریکی پرس دیکھتے ہو یہ سنہری زلفیں دیکھتے ہو۔ رنگین ناخن دیکھتے ہو۔ وہ زخم نہیں دیکھتے جو میرے دل کے اندر ہی اندر رِس رہا ہے۔ میرے حالات دیکھو۔ میری مجبوری تو دیکھو...... مت جاؤ درشن! میں ایک امیر شہزادی نہیں ہوں۔ تمہاری طرح ایک غریب لڑکی ہوں۔ جس کی ایک بوڑھی ماں ہے ایک اندھی خالہ ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو ناگپاڑے کی ایک گندی چال میں رہتے ہیں۔ درشن! کیا تم تین سو روپے میں ہم سب کو سنبھال نہیں سکتے؟ ارے میں گھر کے سارے کپڑے دھو دوں گی

خود اپنے ہاتھ سے استری کروں گی۔ تمہارے لئے کھانا پکاؤں گی،
اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گی۔ اور جب تم تھکے ہارے سو جاؤ گے،
تو تمہارے پاؤں دباؤں گی۔ مجھے اپنے چرنوں سے لگا لو درشن میرے
کپڑے فرانس کے ہیں، لیکن میرا دل ہندوستانی عورت کا ہے ——
ظالم! مت جاؤ ...... مجھ سے مت کچھ کہلواؤ ...... میری صورت
کو دیکھ لو ...... دن رات فائلیں پڑھنے والے درشن! کیا تم ایک غریب
لڑکی کے چھوٹے سے چہرے کو نہیں پڑھ سکتے ......!"

مگر موہنی کچھ کہہ نہ سکی۔

درشن دھیرے دھیرے دکان سے باہر نکل گیا۔

درشن کے چلے جانے کے بعد وہ یکایک چکرا کر فرش پر گر پڑی ——

جب وہ ہوش میں آئی، تو اس نے اپنے آپ کو وارڈن روڈ کے
فلیٹ میں پایا —— مادام سوشا ہر طرح سے اس کی دلداری میں مصروف
رہی ——

سوشا بڑی گھاگ عورت تھی۔ اس نے موہنی سے کچھ پوچھنے کی
ضرورت نہ سمجھی۔ باوقت رائے گو خاموشی سے دکان پر بل کاٹتا رہتا
تھا —— لیکن دیکھتا سب کچھ تھا —— اس نے درشن کے بارے میں
مادام کو سب کچھ بتا دیا تھا —— اور مادام اس وقت موہنی پر وار ی

جا رہی تھیں۔

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے موہنی۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر میری عزیز بچی! یہ تمہاری زندگی کا پہلا غم ہے۔ اسے تو کسی نہ کسی طرح کھا لینا چاہیئے۔ اس غم کی بنیاد پر تم اپنی زندگی کی عسرت تعمیر کر سکو گی۔ تمہیں میری بات سن کر اچنبھا ہوگا۔ مگر یہ بالکل سچ ہے ــــ اس دل کو چرکا کھانے دو۔ کیوں کہ تمہارے مسائل بہت بڑے اور اُلجھے ہوئے ہیں ــ تمہارے بھائی! تمہاری ماں!! شادی تو آخر ہیں ہر عورت کو کرنا ہے مگر سوچ سمجھ کر ــ دل کے ہاتھوں لُٹ کر نہیں ــ دل پر قابو پا کر۔ پانچ چھ سال یہاں کام کر لو گی تو کچھ روپیہ بچا لوگی۔ پھر دھیرے دھیرے تمہاری بڑھتی ہوئی شہرت ایک دیرپا خوشبو کی طرح ہائی سوسائٹی میں پھیل جائے گی۔ اور تمہیں ایک دن ایک ایسا شوہر مل جائے گا جو مالدار بھی ہو، اور تمہاری پسند کا بھی ہو۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہیں میری ڈارلنگ!

اس لئے اس غم کو سہہ لو۔ اس دنیا میں سچی مسرت غم کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جس طرح سے ہر اچھی خوشبو کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں تھوڑی سی بدبو کے اجزا بھی شامل ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے ــ میری بھولی بچی! کہ ہمارے فرانسیسی عطر ساز سو طرح کی

خوشبوؤں کو ملا کر ایک خوشبو تیار کرتے ہیں۔ مگر ہر خوشبو کی بنیاد میں کسی نہ کسی بدبو کے اجزا بھی شامل رہتے ہیں۔ اسی بدبو کی بنیاد پر عطر کی خوشبو بھکی ہے..... یہ زندگی کا اصول ہے۔

موہنی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے سوچا۔ کیا یہ زندگی کا اُصول ہے؟.... محبت کا غم کھاؤ، اور دولت کا انتظار کرو.... کھائیوں کو پاٹو، اور جوانی کو کھودو.... طرح طرح کی خوشبوؤں کو حُسن کی عشوہ طرازیوں میں لپیٹ کر لوگوں تک پہونچا دو، لیکن اگر تمہارے نتھنوں میں کہیں سے محبت کی اڑی اڑی سی خوشبو بھی آجائے، تو فوراً منہ پھیرلو۔ کیوں کہ اس سے کسی کی تجوری پر زد پڑتی ہے.... اور یکایک موہنی کی سمجھ میں آگیا، کہ فورٹ کے علاقے کی جتنی خوشبوئیں ہیں، ان سب کی بنیاد دناگیا رڑے کی بدبو پر ہے۔ مگر جب یہ بات اس کی سمجھ میں آئی وہ چرکہ کھا چکی تھی — اُس کی مسرّت لٹ چکی تھی — درشن جا چکا تھا۔

مادام نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا "میں اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر رہی ہوں"

شام کو وہ گھر پہونچ گئی۔ اُس کی ماں اتنے دنوں سے اُسے رام راج دکھانے پر اصرار کر رہی تھی۔ موہنی نے اپنے دونوں بھائیوں

کے ساتھ ماں کو سینما دیکھنے کے لئے روانہ کر دیا۔ انہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی کے پیسے بھی دے دیئے۔ وہ آج شام چند گھنٹوں کے لئے بالکل اکیلی رہنا چاہتی تھی۔

جب اُس کے بھائی اور ماں چلے گئے، تو اُس نے اپنے بستر کو ٹھیک کیا۔ بستر کے قریب کی کھڑکی کھول دی۔ پرس کھول کر اس میں جائے (JOY) عطر کی شیشی نکالی، جو وہ درشن کی دلہن کو تحفہ میں دینا چاہتی تھی۔ پھر اس نے ایک خط اپنی ماں کو لکھا۔ ایک درشن کو اس کے آفس کے پتے پر۔ پھر اُس نے سلیپنگ پلز کی ساری گولیاں اپنی ہتھیلی پر اُنڈیل لیں، اور انہیں کھا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

کھڑکی سے باہر میلی میلی چھتوں سے پرے آسمان تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پردوں کو ہلانے والی ہوا، پیاز، ہلدی اور کڑوے تیل کی بدبو سے لبریز ہوتی جا رہی تھی۔ بچے چلا رہے تھے۔ مائیں پیٹ رہی تھیں۔ غریبی نے اپنا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ لیا تھا.....

جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں، اور کمرے کی ہر شے اُسے اپنے گرد گھومتے دکھائی دینے لگی، تو اسے کچھ یاد آیا۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنا ہاتھ اپنے پرس کی طرف بڑھایا، اور اس میں سے

ٹیڑول کر سٹونی ہارٹ کی شیشی نکالی - وہ اسے اپنے بستر پر چھڑکنا چاہتی تھی . مگر اُس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی - سٹونی ہارٹ کی شیشی اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر جا گری، اور عطر فرش پر دھیرے دھیرے بہنے لگا......

دوسرے لمحے میں پرس بھی موہنی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا - !

گاڑی جانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا . اور فلاری ڈی سوزا اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر درشن سے کہہ رہی تھی -

"سِلی فول - تم نے اپنی محبت کا اظہار تو اس سے کیا ہوتا ؟"

"اِس کی ضرورت نہ تھی " درشن اُداسی سے بولا " وہ سب جانتی تھی ، اُس نے مجھے ٹھکرا دیا "

" کیسے تم یہ کہہ سکتے ہو؟ " فلاری ذرا غصے سے بولی -

" کیا تم نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی ؟ "

" نہیں ! مگر کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی تھی ؟ " درشن نے چڑ کر کہا -

فلاری انتہائی غصے سے بولی "تم نے اس سے پوچھا تو ہوتا، اُس سے کہا تو ہوتا، اُس کا انکار سُنا تو ہوتا، لوگ تو پانچ پانچ برس تک عورت سے انکار سنتے ہیں۔ آخر میں اُس سے ہاں کرا لیتے ہیں"۔

"کوئی فائدہ نہ ہوتا فلاری" درشن کندھے جھٹکا کر بولا "وہ امیر تھی میں غریب تھا۔ وہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی، اپنی گاڑی میں بیٹھ کے دکان آتی تھی۔ ہزار روپے کا گون پہنتی تھی"۔

"او جاہل! جاہل!!" فلاری چلائی "تم نے سب چوپٹ کر دیا۔ ارے بے وقوف وہ تو میری طرح غریب لڑکی ہے۔ مادام کی گاڑی میں آتی تھی، مادام کی گاڑی میں جاتی تھی۔ گون اُس کے اپنے نہ تھے، دکان کے تھے۔ وہ وارڈن روڈ پر نہیں رہتی ہے، ناگپاڑے میں رہتی ہے ایک معمولی سی کھولی میں۔ اُس کا اڈریس مجھے معلوم ہے؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

فلاری نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "جس دن سے تم نے مجھے سنیما لے جانا بند کر دیا، میری طرف پیار سے دیکھنا بند کر دیا، کیا میں اتنا بھی معلوم نہ کرتی؟ گدھے! گدھے!!" فلاری نے اپنا پرس کھولا، اور اُس میں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر درشن کے ہاتھ میں

دے کر کہا ---

"یہ اُس کا پتہ ہے"

اس کے بعد فلاری روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی۔

درشن تھوڑی دیر تک توبھونچکا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اُسے کچھ یاد آیا۔ اُس نے کاغذ کے پرزے کو غور سے دیکھا، اپنا بیگ اُٹھایا، اور اسٹیشن کے باہر آکر ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"موہنی! موہنی!!"

دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

"موہنی! موہنی!! .... میں آگیا ہوں۔ میں درشن ہوں۔ میں تیرا درشن! موہنی دروازہ کھولو! میری موہنی!!"

مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

درشن نے ذرا سا زور لگایا۔ دروازہ خودبخود کھل گیا۔ درشن اندر چلا گیا۔

سامنے بستر پر موہنی مُردہ پڑی تھی۔ تپائی پر دو خط تھے۔ ایک موہنی کی ماں کے نام، ایک درشن کے نام۔ ایک عطر کی شیشی تھی جائے (۵۶ ت) درشن کی دلہن کے لئے..... ایک عطر کی شیشی فرش پر گر کر ٹوٹ چکی تھی...... اور اُس کی خفیف اُداس خوشبو ساری فضا میں پھیل رہی تھی۔

"موہنی" — درشن نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا "میرا انتظار تو کرلیا ہوتا۔ پگلی!"

تھوڑی دیر تک وہ چُپ چاپ ساکت کھڑا رہا۔

پھر یکایک وہ بستر پر گر گیا۔ اُس نے موہنی کے دونوں پاؤں اپنے ماتھے سے لگا لئے۔ پھر اپنے..... ہونٹوں سے لگا لئے۔ پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا —

"اوہ.... اوہ.... سٹونی ہارٹ!!"

کھٹے انار، میٹھے انار

وہ اِس دُنیا میں میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ اُس کا جسم دُبلا تھا۔ قد چھوٹا، رنگ سیاہ، گال اندر کو پچکے ہوئے، ہونٹ بے حد سیاہ، لیکن جب وہ ہنستا تھا تو اس کے سارے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اُس کی گول گول سیاہ بٹن جیسی آنکھوں میں دلیری اور شرارت کی چمک آجاتی تھی، اور اُس کی تیز ہنسی کا فوارہ یُوں پے در پے قہقہوں میں پھُوٹتا تھا، جیسے دیوالی کی رات میں سیاہ آسمان کے پس منظر میں ایک آتشیں انار فضا میں بلند ہو جائے! اُس کا نام منو تھا۔ وہ ہمارے باغ کے مالی کا لڑکا تھا۔ اُس کی عمر بمشکل چھ سات سال کی ہوگی۔ اتنی ہی میری عمر بھی ہوگی۔

ہمارا باغ بہت خوب صورت تھا۔ اُس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے فوارے تھے۔ پھولوں کے قطعے تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں اور ڈھلوانیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ جس پر ایک مُنّا سا پُل بنا ہوا تھا۔ غروبِ آفتاب کے وقت میری بڑی بہن اور اس کا شوہر اکثر وہاں آتے تھے۔ اور اُس پُل پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آلوؤں کی طرح ڈوبتے ہوئے سُورج کو چُپ چاپ دیکھا کرتے۔ اور منہ سے کچھ نہ کہتے۔ جانے یہ بڑی عمر کے لوگ ڈوبتے ہوئے سورج میں کیا دیکھتے ہیں؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہمارے باغ میں کاشمیری سیب تھے اور فرنچ ایپل اور کلّو کے کھٹے میٹھے سیب تھے۔ سنہری خوبانیوں کے پیڑ تھے۔ اور ہری ہری جلد والے پلم جو پک جاتے تو جگہ جگہ سے اُودے اُودے ہو جاتے اور اُن کی جلد میں دانت گڑو دو تو ان میں سے لہو کی طرح سُرخ رس نکلتا تھا۔ وہاں پر بگو گوشے تھے اور ناخ اور ٹینگ، آلوچے، آلو بخارے، شفتالو، چیری اور شہتوت۔ جب بہار آتی، تو اتنے رنگوں کے پھول لے کر آتی، اتنے پرندوں کی چہکاریں لے کر آتی، اتنے بھونروں، شہد کی مکھیوں اور رنگین تتلیوں کی اُڑانیں لے کر

آتی کہ اُن سب کے پیچھے بھاگنا مشکل تھا - بڑا ہی خوب صورت باغ تھا ہمارا - دنیا کا وہ کون سا درخت تھا جو ہمارے باغ میں نہیں تھا ـــــ؟

بس ایک کمی تھی - ہمارے باغ میں انار کا پیڑ نہیں تھا! چھوٹی چھوٹی کئی اناریوں کے تو بہت سے پیڑ تھے - لیکن میٹھے انار کا ایک بھی پیڑ نہیں تھا - اور جتنے میٹھے انار تھے سب راجہ جی کے باغ میں تھے - دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے - اور جب ہمارے باغ میں نہ تھے تو اور کہاں ہوں گے؟

نہر میں نہاتے نہاتے جو اوپر کے پہاڑی چشموں سے آتی تھی، اور شہر کے لئے پانی پینے کے لئے لاتی تھی، اور راجہ جی کے باغ کے قریب سے گذرتی تھی - جب میں اور منو راجہ جی کے خاردار آہنی جنگلوں کے پیچھے میٹھے اناروں کو درختوں سے لٹکتے ہوئے دیکھتے تو ہمارے منہ میں پانی بھر آتا - کیسے پیارے پیارے انار تھے وہ! جلد کیسی صاف اور شفاف - ہلکا ہلکا اُودا پن اپنے رخساروں پر لئے ہوئے وہ انار کس طرح فضا میں جھولتے اور ہنستے دکھائی دیتے تھے - پہلے تو انار کی شاخوں پر منہ بند کلیاں پھوٹتی تھیں پھول نہیں کلیوں میں شہابی رنگ کے پھول کھلتے تھے - پھر ان

پھولوں کے دہانے سے چھوٹے چھوٹے چوکور انار پیدا ہوتے تھے، اور بڑھتے بڑھتے شہد کی ڈبیوں کی طرح لٹکنے لگتے تھے پھر ایک دن شاخیں خالی ہوجاتیں اور ہمیں معلوم ہوجاتا کہ جتنے میٹھے انار تھے سب راجہ جی کے محل میں پہونچ گئے۔

نہر میں تیرتے تیرتے میں اور منو خالی درختوں کو بڑی حسرت سے تکا کرتے۔ کیا ہماری قسمت میں میٹھے انار کبھی نہ آئیں گے؟

ایک روز جب میٹھے اناروں کا جوبن عین شباب پر تھا، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پانی میں تیرتے تیرتے پانی کی کلیاں منو پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"چلو راجہ جی کے باغ میں چلیں۔ میٹھے انار توڑ لائیں۔"

منو ڈر گیا۔ بولا "راجہ جی ماریں گے!"

"راجہ جی کہاں ہیں بدھو۔ وہ تو اپنے محل میں ہیں۔"

"تو مالی ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے۔ راجہ جی کے باغ کا مالی کتنا ظالم ہے۔ میرا باپ کہتا تھا ....."

میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا "اس تپتی دوپہر میں مالی کہاں ہوگا۔ سو رہا ہوگا۔ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا!"

"کسی جھاڑی کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوگا۔ چھوڑو!" منو نے انتہائی

رازداری سے کہا، ”تم نہیں جانتے سبھی مالی ایسا کرتے ہیں - میرا باپ بھی اسی طرح گھات لگا کے بیٹھتا ہے اپنے باغ میں - جب باہر کے لڑکے باغ پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں - میں سب جانتا ہوں !“ وہ بڑی دانش مندی سے بولا -

میں نہر سے نکل کر خاردار آہنی جنگلے کے قریب آگیا اور بولا

”منّو، بڑے بزدل ہو - اندر جانے سے ڈرتے ہو ؟“

مُنّو اچک کر کنارے پر آ رہا - اور اپنی لنگوٹی کستے ہوئے بولا -

”کون ڈرتا ہے ؟ میں کہ تم ؟ اندر چل کے دیکھو !“

اتنا کہہ کر وہ دو تاروں کو اوپر نیچے کھینچ کر باغ کے اندر کود گیا - اس کے پیچھے میں کودا - جلدی جلدی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے ہم دونوں ایک ہی پیڑ پر چڑھ گئے - اور میٹھے انار توڑ توڑ کر اپنی جھولیاں بھرنے لگے -

لیکن پہلا انار ہم نے جھولی میں نہیں ڈالا - اُسے توڑ کر فوراً دانت سے کاٹا - میٹھے اناروں کا شہد ——— اور اس کی چادر کا کڑوا ذائقہ، دونوں ذائقے ایک ہی لمحے میں ہماری زبان پر آئے - لیکن برسوں کی حسرت کا ذائقہ بُھلا دیا - ہونٹوں پر اناروں کی شہد آگیں مٹھاس باقی رہ گئی -

میں نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا: "ہونہہ! کتنا میٹھا ہے!"
اس کے بعد پیڑوں کی ڈالیاں یکے بعد دیگرے ہلنے لگیں،
ہم نے اتنے انار توڑ لیے جتنے ہماری جھولی میں بھی نہ آسکتے تھے۔
بڑی مشکل سے اور بڑی حسرت سے ان اناروں کو تکتے ہوئے
ہم پیڑ سے اُترے۔

ابھی کتنے ہی انار درخت پر باقی رہ گئے تھے۔ اور ابھی سارا
باغ ان اناروں سے بھرا پڑا تھا۔ کاش ہماری جھولی بھی اتنی بڑی
ہوتی جتنا ہمارا دل تھا!

"چلو اب بھاگ چلیں!" میں نے صلاح دی!

منو کی للچائی ہوئی نظریں دوسرے پیڑ پر پڑیں۔ اُس نے
آہستہ سے کہا۔

"چنو، دیکھو۔ اس پیڑ کے انار کتنے بڑے بڑے ہیں!"

"مالی آجائے گا!"

"مالی کی ایسی تیسی!" منو بڑی جیداری سے بولا۔

"راجہ جی آجائیں گے!"

جواب میں منو نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ منو کے لبوں کو
خون لگ چکا تھا۔ اب وہ کسی راجہ کی پروا نہ کرتا تھا۔

منّو نے کہا "ہم ان اناروں کو اس جھاڑی کے نیچے چھپا دیں گے، اور اس پیڑ پر چڑھ کر بڑے بڑے انار توڑیں گے"

ہم دونوں جھاڑوں کے پیچھے جا کر اپنی اپنی جھولی کی گانٹھیں کھول کر انار نیچے گرانے ہی والے تھے کہ ایک زبردست ہاتھ منو کی گردن پر پڑا اور ایک میری پیٹھ پر۔ اور کسی نے زور سے ہمیں گھما کر اپنی مضبوط ٹانگوں میں جکڑ لیا۔

ایک دیو ہیکل مالی ہمارے سر پر کھڑا تھا۔ اور ہم اُس کی ٹانگوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور ہماری جھولیاں اناروں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں اور منو رونے لگے۔ خاردار جنگلے کے باہر کیسی خوبصورت نہر تھی۔ اُس کا نیلا اور چمکتا ہوا پانی نرل رِل ترل رِل کرتا ہوا کس بے باکانہ آزادی سے بہہ رہا تھا۔

مالی نے ہم دونوں کو لے جا کے راجہ جی کی حوالات میں بند کر دیا —!

سارے شہر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ راجہ جی کے باغ میں چور گھس آئے تھے۔ انہوں نے راجہ جی کے میٹھے انار توڑ لئے تھے۔ صدیوں سے کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ راجہ جی کے میٹھے

اناروں کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی دیکھے۔ حسرت ہر ایک کے دل میں تھی۔ ہمت کسی کے دل میں نہ تھی۔ ایک دم یہ کیسے ہو گیا۔!؟
لوگ متعجب تھے۔ اور جوق در جوق ہمیں دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ اور ہمیں دیکھ کر اور بھی حیرت کا اظہار کرنے لگے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے۔ ننگ دھڑنگ بچے۔ ایک لنگوٹی پہنے ہوئے۔ دوسرا خالی نیکر پہنے ہوئے۔ یہ نحیف اور کمزور بچے۔ انہوں نے میٹھے اناروں پر ہاتھ ڈالا تھا؟

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ دو گھنٹے گذر گئے۔ تین گھنٹے گذر گئے، جب سہ پہر جانے لگی تو حوالات کا آہنی دروازہ شور مچاتے ہوئے کھلا۔ اور میرے والد میری روتی ہوئی والدہ کو لے کر حوالات میں داخل ہوئے۔

میری والدہ نے لپک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا — اور سسک سسک کر رونے لگی، اور میرا منہ چومنے لگی۔ میں بھی رونے لگا۔ اور منو بھی!

میرے والد نے منو کو انگلی سے لگا لیا۔ اور بولے۔

"چلو! گھر چلو!!"

میں اپنے والد کے ساتھ ہولے ہولے چلنے لگا۔ یکایک منو

دوڑتا ہوا آیا، اور میرے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔" چاچا جی،
مجھے بھی لے چلو۔ چاچا جی!"

میرے باپ نے پلٹ کر منو کو ایک لات جمائی۔ منو دھڑام
سے حوالات کے سخت فرش پر جا گرا۔ اور پھر اٹھا۔ اب کے میری
ماں نے اسے زور کا طمانچہ رسید کیا۔ اور بولی۔

"بدمعاش ہمارے بچے کی عادت بگاڑتا ہے۔ اسے بُری
بری باتیں سکھاتا ہے!"

"میں نے تجھے اسی دن کے لئے کہا تھا" میرے والد میری
ماں سے تہدیدی آواز میں کہنے لگے "اپنے بچے کو بری صحبت سے
بچائے رکھ۔ انہیں ان کمینوں کے ساتھ نہ کھیلنے دے۔ مگر تو کہاں
میری بات سنتی ہے؟"

تھانے دار بولا "ڈاکٹر صاحب! آپ راجہ جی کا علاج کرتے
ہیں۔ اسی لئے آپ کے بچے کو چھوڑ دیا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں راجہ جی
کے باغ میں کوئی چڑیا پر نہیں مار سکتی!"

"میں جانتا ہوں! میں جانتا ہوں" میرے والد بڑی بے بسی
سے بولے "آپ کی بڑی مہربانی ہے تھانے دار صاحب! آئندہ سے
میں خود خیال رکھوں گا"

میرے والد مجھے لے کے چلے آئے۔ حوالات کا آہنی دروازہ منو پر بند ہوگیا۔

شام ڈھلے منو بھی واپس آ گیا۔ مالی کی تو ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن منو کی ماں اپنے چاندی کے کڑے گروی رکھ کے دس روپے لے کے تھانے دار کے پاس گئی۔ اور اس سے اپنا بچہ چھڑا لائی۔ جب میں نے منو کو دیکھا۔ تو وہ اس وقت اپنے جھونپڑے سے کچھ دور حیران و پریشان گلاب کی ایک جھاڑی کے پاس کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ میں خوشی کے مارے بھاگتا ہوا اس کے پاس گیا، اور اس سے کہا ـــــ

"آؤ منو کھیلیں"

منو چپ رہا۔

میں نے منو کو لالچ دلاتے ہوئے کہا ـــــ "آؤ شرط بدتے ہو؟ اگر تم آڑو کی اُس آخری ٹہنی تک پہونچ جاؤ۔ تو میں تمہیں چار پیسے دُوں گا"

"چار پیسے! چار پیسے!!"

چار پیسے بہت ہوتے ہیں۔ منو کی آنکھوں میں حرص اور خوشی کی ایک چمک ایک لحظے کے لیے پیدا ہوئی۔

مجھے بھی معلوم تھا، اور منو کو بھی معلوم تھا، کہ منو مجھ سے زیادہ تیزی سے درخت کی آخری پھننگ پر پہونچ سکتا ہے ۔ وہ پیسے تو گویا اُس کی جیب میں تھے ۔ مگر وہ خوشی کی کھلکھلاتی ہوئی چمک صرف ایک لحظے کے لئے منو کی آنکھوں میں نمودار ہوئی ۔ دوسرے لمحے میں یکایک بجھ گئی ۔ مُنّو نے انکار میں سَر ہلا دیا ۔

" منّو! مجھے معلوم ہے کس پیڑ کی شاخ پر دو ناشپاتیاں پک کے سنہری ہو گئی ہیں ۔ آؤ اُن کو چل کے حاصل کرلیں ۔ ایک میں لوں گا ۔ دوسری تمہیں دوں گا "

" سچ !؟ "

منو نے پھر آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا ۔

" دیکھو منو شام جا رہی ہے ۔ خوب صورت تتلیاں پھولوں میں سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈھ رہی ہیں ۔ آؤ تتلیاں پکڑ لیں ۔ ڈھیر ساری تتلیاں پکڑ لیں ۔ اب وہ اڑ نہ سکیں گی "

منّو نے پھر انکار میں سر ہلا دیا ۔

" میں تمہیں دو بنٹے دوں گا ۔ آؤ میرے ساتھ کھیلو "

منّو نے پھر سر ہلا دیا ۔

میں نے بڑی لجاجت سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ۔ اور

اُس سے کہا — "کیوں منّو۔ میرے ساتھ کیوں نہیں کھیلو گے؟ کیا تم میرے دوست نہیں ہو؟"

منّو کا ہاتھ ذرا سا آگے بڑھا۔ پھر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ اُس کی گردن کا حلقوم دو تین بار گویا اُس کی دبلی پتلی گردن کے اندر رگڑ کھاتے ہوئے اوپر نیچے گذرا۔ پھر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"نہیں چُنو۔ تم ڈاکٹر کے لڑکے ہو۔ میں مالی کا لڑکا ہوں۔ میری تمہاری دوستی کیا؟"

اتنا کہہ کر وہ روتا ہوا مُڑا۔ اور اپنے جھونپڑے کے اندر چلا گیا!

چینی پنکھا

میں نے شادی نہیں کی۔ زندگی میں مجھے عورت سے کبھی محبت نہیں ہوئی — صرف ایک بار، ایک لڑکی مجھے ذراسی پسند آئی تھی۔

میں نے اسے پہلی بار پیڑاش ریستوران میں دیکھا تھا وہ وہاں ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ پیڑاش ریستوران بمبئی میں پہلا ریستوران تھا، جس نے بیرا گیری کے کام کے لئے عورتیں ملازم رکھی تھیں۔ ہلکے گلابی فراک میں ملبوس سُبک اندام لڑکیاں پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی ایک ٹیبل سے دوسرے ٹیبل تک لچکتی چلی جاتی تھیں۔ اُن کی خوبصورت مسکراہٹیں، رنگین ناخن، اور جگمگاتے ہوئے چہرے ریستوران کو روز بروز مقبول تر بناتے جا رہے تھے۔ میں بھی وہیں پہونچا — جہاں ہر

بوالہوس پہونچتا ہے۔ وہاں میں نے پہلی بار سربتا کو دیکھا۔
اُس کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے، اور اُس نے انہیں پیچھے سے کس کر اُن کی پونی ٹیل بنا ڈالی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں تھی۔۔ لپ اسٹک نہ ہونی تو کوئی بات نہ تھی —— مگر مسکراہٹ بھی تو نہیں تھی۔ رنگ ایسا کھلتا ہوا تھا جیسے کسی نے نربدا کی سنگِ مرمر کی پہاڑیوں سے تراشا ہو۔ اُس کا گلابی فراک اُس کے جسم پر بالکل پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے لوگ اس کا رنگ دیکھنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ اُس کی چال دیکھنے آتے تھے۔ اس کی چال میں شاعرانہ تمکنت کے ساتھ ایسی دِل رُبا آوارگی تھی کہ اُسے دیکھ کر بیک وقت کلوپیٹرا اور ریارلین منرو کا خیال آتا تھا۔ جب وہ آرڈر لے کر چلتی تھی تو مرد اس حسرت سے اُس کی پُشت کو دیکھتے تھے جیسے کسی عورت کو نہ دیکھ رہے ہوں تاج کو دیکھ رہے ہوں!

جب وہ اپنے مخصوص نک چڑھے انداز میں میرا آرڈر لے چکی تو میں نے اُس سے کہا۔

"تم مسکراؤ گی نہیں؟"

"کیا یہ بھی آرڈر میں شامل ہے؟" اُس کی اُچٹتی نگاہ میر

سر کے اوپر کہیں چلی گئی۔

"آرڈر ہیں تو نہیں، آداب میں شامل ہے!"

اُس کے ہونٹ اپنی جگہ پر ذرا سے ہلے۔ کیسے غصیلے، خمیدہ، پتلے ہونٹ تھے وہ! پاگل بنا دینے والے۔ ان ہونٹوں کی معنی کیسی جان لیوا ہوگی؟ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ اور اس سے کہا۔

"اِس وقت تمہارے ہونٹ ہملیٹ کی طرح سوچ رہے ہیں، مسکراؤں کہ نہ مسکراؤں؟"

"افسوس ہے کہ آپ ہملیٹ نہیں ہیں۔" اُس نے بڑی نخوت سے کہا۔

"تم کون سی روتی لیا ہو؟" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا اُس کی اُچٹتی ہوئی نگاہ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں واپس آگئی۔ وہاں اُس نے کچھ ڈھونڈا۔ دوسرے لمحے میں وہ پُشت پھیر کر واپس چلی گئی۔

معلوم نہیں اسے میری آنکھوں میں کچھ ملا یا نہیں ملا مجھے اس کے مستانہ خرام میں بہت کچھ مل گیا۔

آپ کو چونکنا نہیں چاہئے۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں نے آج تک شادی نہیں کی۔ کسی بھی عورت سے محبت نہیں کی۔ اسی لئے

اچھے اخلاق پر میں آپ کا لیکچر سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جب وہ بھری ان ون آئس کریم کی پلیٹ میرے سامنے رکھ چکی تو بولی ــــ

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس ریستوران میں جتنے مرد آتے ہیں، وہ آئس کریم کھاتے ہیں، اور جتنی عورتیں آتی ہیں، وہ کافی کا آرڈر کرتی ہیں؟"

میں نے کہا ــــ "اس لئے کہ مرد کافی ہوتے ہیں، اور عورتیں آئس کریم!"

وہ برجستہ بولی "میرے خیال میں مرد ناکافی ہوتے ہیں!"

میں بھنا کر اُسے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ مگر وہ مسکرا کر پلٹ گئی، بہت ہی تلخ اور زہریلی مسکراہٹ تھی وہ۔ یہی مسکراہٹ تو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان لبوں کا زہر بھی اگر پینے کو مل جائے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے دل میں سوچا۔ پھر اس خیال کو دل سے مٹا دیا۔ ہونہہ! کیا بے ہودہ خیال ہے۔ عورت سے آئس کریم بہتر ہے۔ کیوں کہ آئس کریم تو ختم ہو سکتی ہے لیکن عورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی کھوپڑی کو بہت شفقت سے تھپتھپایا! شاباش تم بہت عقل مند دماغ ہو۔ بہت اچھا بھیجا رکھتے ہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے

کوئی عورت مجھ پر قبضہ نہیں کر سکتی۔
میں آئس کریم کھا کر پیٹرش ریستوران سے چلا آیا، اور پھر کبھی وہاں نہیں گیا ــــ!
کوئی چار ماہ کے بعد پھر سریتا سے ملاقات ہو گئی۔ کف پرید پوائنٹ کے قریب سمندر کے کنارے ایک بہت بڑا کشتی نما ریستوران کھلا تھا۔ جس میں نوجوان لڑکیاں جہازیوں کا سا لباس پہنے ہوئے بیرہ گیری کرتی تھیں۔
"ہائی سیلر!" میں نے سریتا کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا "بیئر کا ایک گلاس لاؤ!"
آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے۔ کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ پروفیشن ہے۔ لیکن میں تو سریتا کی ہنسی دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ معلوم تو مجھے بھی تھا۔
لیکن سریتا میرا جملہ سن کر بالکل نہیں ہنسی۔ وہ میرے ٹیبل پر نہیں رکی، بلکہ دوسرے ٹیبل پر آرڈر لینے چلی گئی۔ اور میرے ٹیبل پر کوئی دوسری ہی لڑکی آ گئی۔ بڑی دل نواز لڑکی تھی یہ، بے حد متر نم اور دل ربا۔ چال بھی اچھی، ادا بھی اچھی، مسکراہٹ بھی اچھی۔ ہر پہلو سے سینما کے اشتہار کی طرح مکمل! ایئر ہوسٹس کی طرح ممتا سے لبریز!

وہ اپنے ہاتھ میں پلاسٹک کی جلد میں ملفوف مینو لئے میرے ٹیبل پر جھک گئی۔

میں نے اُس سے کہا۔

"میں آرڈر دے چکا ہوں!"

"کسے؟"

"وہی جو تمہارے ہوٹل میں سب سے بددماغ لڑکی ہے اِسے آرڈر دے چکا ہوں"!

اُس نے ایک لمحے کے لئے سرینیا کی پشت کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف بڑی ادا سے ایک جگمگاتی ہوئی روشن مسکراہٹ اس طرح پھینکی جیسے دیوالی کی رات میں بچے ایک دوسرے پر پھلجھڑی پھینکتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ کہہ رہی تھی ـــ

"اخاہ! میں سب جانتی ہوں!"

ہر عورت یہی سمجھتی ہے کہ وہ مردوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مگر یہ ہمیں جانتے ہیں کہ وہ کیا جانتی ہے۔ بھلا مچھلی سمندر کے بارے میں کیا جان سکتی ہے؟"

تھوڑی دیر کے بعد سرینیا میرے ٹیبل پر آئی۔ بولی۔

"ڈالی بولتی ہے۔ تم نے مجھے آرڈر دیا ہے۔ لیکن میں نے تمہارا

آرڈر نہیں لیا!"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اب عرض کرتا ہوں"

"فرمائیے!"

وہ پیشہ ور ویٹرس کی طرح مؤدب انداز میں میری میز پر جھکی۔

اس کی شفاف جبیں پر سُوبَل تھے!

میں نے کہا۔

"مجھے ایک فرائی مسکراہٹ چاہیے۔ غصے میں تلی ہوئی!"

وہ چونکی۔ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی شفاف جبیں کے ٹیڑھے تیور بھی غائب ہو گئے۔ اب اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ جیسی ہنسی سی آ گئی۔ جو مجھے بہت پسند تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔

"اس ریستوران کے گاہکوں کو تمہاری کون سی ادا پسند ہے؟"

"وہی میری آوارہ چال! کیسی گندی نظروں سے میری پُشت کو دیکھتے ہیں۔" سر بتا خفا ہو کے بولی "حالانکہ نطشے عورت کے بے ہنگم دھڑ کے بارے میں اتنا کچھ کہہ چکا ہے!"

میں نے پوچھا "تم نطشے اور شیکسپیئر پڑھ کر بھی اس ریستوران میں نوکری کرتی ہو۔ کیوں؟"

جواب میں وہ بولی ـــــ

"کہئے تو آپ کا بھی صفائی کرلاؤں - بہت ٹوٹ لینا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے مُربیانہ انداز میں کہا ـــــ

"میرا خیال ہے میں تم سے دلچسپی لے سکتا ہوں۔ تم مجھے ایسی عورت معلوم ہوتی ہو، جس سے آدمی بور ہوئے بغیر دس منٹ بات کر سکتا ہے۔ کرسی کھسکا لو، اور میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے آئین سٹائین کے فلسفۂ اوقات پر نہ بحث کروں گا جس میں وہ کہتا ہے کہ اگر ہم زمین سے مریخ تک روشنی کی رفتار سے اُڑیں تو وقت آدھا رہ جائے گا اور ہمارے دل کی دھڑکن بھی آدھی ہو جائے گی، اور......."

"اور اگر میں آپ سے اسی طرح باتیں کرتی رہی تو منیجر کے دل کی دھڑکن بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔" وہ طنزاً بولی "اب آپ مجھے ایک لمبا سا آرڈر دے دیجئے۔" وہ پنسل کی نوک پیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

شام کے آٹھ بجے کے قریب میں اپنی گاڑی لے کر کف پریڈ

پوائنٹ پر پہونچ گیا۔ مجھ سے پہلے چار گاڑیاں اور کھڑی تھیں، اور اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سرِیتا کشتی نما ہوٹل سے نکلی۔ اب اُس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے اُودے رنگ کی کیمپی دام کی ایک نفیس ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بانس کی کھپچیوں کا بنا ہوا شانتی نکیتن کا منقش بیگ، پاؤں میں سُورت کے سنہری سینڈل۔ پونی ٹیل غائب تھی۔ سیدھی مانگ اور چمپا کی وینی سے مہکتا ہوا جوڑا، ہونٹوں پر لپ اسٹک کا جگمگاتا ہوا رنگ، اور ایک میٹھی، مہربان اور معصوم مسکراہٹ!

اُس نے باہر نکل کے چند لمحوں کے لئے اپنا ہینڈ بیگ جُھلایا، پانچوں گاڑیوں کو دیکھا۔ آخر وہ شرماتے، لجاتے، ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے میری گاڑی کے پاس آئی اور سمٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور مسکین لہجے میں بولی۔

"چلئے —!"

کیسا نرم اور ملائم لہجہ تھا۔ بالکل پلاسٹک کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کیسی سرِیتا ہے؟ میں سوچنے لگا۔

سرِیتا نے شرما کر آہستہ سے میرے کوٹ کے کالر کو چھوا، اور

دھیرے سے بولی —

"اب چلئے بھی۔ مجھے اِن مُردوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ دیکھئے کس طرح یہ چاروں گاڑیوں والے مجھے گھور رہے ہیں! جلدی چلئے پران ناتھ!"

"پران ناتھ" پر مجھے ہنسی آگئی۔ کم بخت بہت اچھی ایکٹنگ کرتی ہے! ہم دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی بڑھانے کے لئے کہا۔

گاڑی شہر سے باہر سڑک پر جا رہی تھی، اور گو سمندر کے کنارے جا رہی تھی، پھر بھی اکتوبر کی اُمس سے جان جھلسی جا رہی تھی۔ بمبئی میں اکتوبر کے مہینے میں جیل خانے کی سی گرمی ہوتی ہے۔

"ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" سر بتا نے بڑی بے پروائی سے پوچھا، اور کچھ اس انداز سے پوچھا۔ جیسے کہہ رہی ہو اگر ہم جہنم میں بھی چلے جائیں تو مجھے کوئی عذر وانکار نہ ہوگا۔

میں نے کہا: "دھار لیک پر چلوگی؟"

وہ دفعتاً چونکی: "دھار جھیل پر کیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"کسی جگہ بھی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا: "اور ہر جگہ سب

کچھ ہے۔!"

"کسی جگہ بھی کچھ نہیں ہے" اُس نے بڑی آزردگی سے کہا اور پشت کے گدّوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔" وہاں ایک جھیل ہے۔ جھیل میں پانی ہے۔ پانی میں کشتی ہے۔ کشتی میں دو دل ہیں!"

" دو دلوں میں راکھ ہے۔ راکھ میں چنگاری ہے" وہ میری بات مکمل کرتے ہوئے بولی" چنگاری میں آگ ہے۔ آگ دل کو جلاتی ہے!"

میں نے کہا" جھیل کے قریب ایک ڈاک بنگلہ ہے اور کل اتوار ہے"۔

وہ بولی" آج تک میں کسی ڈاک بنگلے میں نہیں رہی۔ ڈاک بنگلہ؟ ڈاک بنگلہ؟ چھی! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوسٹ آفس کا چھوٹا بھائی ہو!"

میں نے فوراً جواب دیا" کوئی مضائقہ نہیں۔ قریب کی پہاڑی پر میرے ایک دوست آنند کا بنگلہ ہے"۔

وہ پھر چونکی۔ جیسے اپنے دل سے پوچھ رہی ہو۔ اب کیا بہانہ کروں۔ بولی" کون آنند؟"

میں نے کہا "دھرم پال آنند! تم اُسے نہیں جانتی ہو۔ اُس نے ایک مشہور فلم ایکٹریس سے شادی کرلی ہے۔ جس کے پاس بلیک کا ساٹھ لاکھ روپیہ ہے اور عمر صرف پچاس برس ہے۔ لیکن دھرم پال آنند اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ تم دھرم پال آنند کو دیکھو گی تو حیرت میں رہ جاؤ گی۔ بالکل چینی کا بنا ہوا خوب صورت لڑکا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی انسان کہہ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی مرد بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے؟"

"واقعی ــــ؟"

وہ جیسے خوابوں میں کھو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اُسے بہت دیر تک خاموش دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں!" وہ چونک کر بولی۔ اور یکایک اس کی بشاشت عود کر آئی۔ وہ میری طرف چبھتی ہوئی شریر نگاہوں سے دیکھ کر بولی ــــ

"اچھا بتاؤ تم کام کیا کرتے ہو، اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جیون ہے۔ میں ــــ پہلے ــــ ایک اخبار میں رپورٹر تھا، اور بھوکا مرتا تھا۔ اب میرے پاس ایک گاڑی ہے۔ اور میں

سونے کی اسمگلنگ کرتا ہوں"۔

سرنیتا بولی —" یوں کہو۔ اب میں سونے کی اسمگلنگ کرتا ہوں اور میرے پاس ایک گاڑی ہے!۔"

میں غصے میں بولا —" مگر یہ دھندہ بالکل صاف ہے۔ اور ایمان داری کا دھندہ ہے۔ میں باہر سے جو سونا منگاتا ہوں، وہ مجھے یہاں ساٹھ روپے تولہ پڑتا ہے، نوّے روپے میں اسے بیچ دیتا ہوں — سیدھا صاف دھندہ ہے۔ نہ کوئی کھٹ پٹ نہ پرمٹ۔ نہ کسی کو رشوت دوں، نہ کسی کے گھر ڈالی لے جاؤں۔ اپنا کام خود کرتا ہوں — جب جیل جاتا ہوں، خود جاتا ہوں کسی دوسرے کو جیل نہیں پہنچاتا —"

"کتنی بار جیل جا چکے ہو؟"

"دو بار!"

"ویری گڈ! بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے پوچھا:" وہ چار گاڑیوں والے کون تھے؟"

سرنیتا نے کہا —" مت پوچھو۔ زندگی بڑی پیچیدہ ہے"۔

میں چپ رہا۔ مجھے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ میں نے چاروں کو زک دی تھی۔ سرنیتا میری گاڑی میں ہے۔ میں کسی کی کیا پروا

کرتا ہوں - کم بخت کس آسانی سے میری گاڑی میں چلی آئی - اتنی آسان فتح مجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی - دو چار دن اس نے مجھے جلایا ہوتا - چکر دیئے ہوتے - ہزار دو ہزار خرچ کروا دیئے ہوتے، تو مزا بھی آتا - کتنی احمق لڑکی ہے - دوسری ہی ملاقات میں گاڑی میں بیٹھ کر چلی آئی - یہ بے چاری بھی عورت نکلی - مجھے سرتیا پر رحم آنے لگا - میں نے اپنا بازو اس کی پشت کی طرف بڑھایا ـــــ سرتیا ایک دم تڑپی ـــــ آگے کو ہو کر جو کتی بیٹھ گئی ـــــ پھر اس نے اپنا بیگ کھولا - اس میں سے ایک دستی پنکھا نکالا، اور اسے کھول کر جھلنے لگی

"اُفوہ! بڑی گرمی ہے!" وہ پنکھا جھلتے ہوئے بولی -

یہ ایک سبک، خوش نما دستی چینی پنکھا تھا - صندل کی لکڑی کا بنا ہوا - سمٹ کر دو انگلیوں میں آجاتا تھا، اور پھیل کر پورے چہرے کو ڈھک لیتا تھا -

لیکا یک سرتیا نے اک ادا سے اس چینی پنکھے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا - اور اس کی شربر نگاہیں میرے دل و جگر کو برمانے لگیں

میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا -

سرتیا نے فوراً وہ پنکھا کھول کر میرے سامنے رکھ دیا، بولی

"دیکھو اس پر کیا لکھا ہے؟"

میں نے چینی پنکھا اپنے ہاتھ میں لے لیا اسے سُونگھا۔ صندل کی ہلکی ہلکی مہک اُس کے ریشے ریشے سے آتی تھی۔ آخری دو دستوں پر دو تصویریں کھُدی تھیں۔ ایک طرف ایک پہاڑی کے نیچے ایک چینی مرد کھڑا تھا، اور دوسری طرف ایک عورت تنگ کے چھتار سے کے نیچے کھڑی تھی۔ بیچ کے نازک منقش دستوں پر چینی زبان میں ایک عبارت کندہ تھی۔

"کیا تم پڑھ سکتے ہو اسے؟" سریتا نے مجھ سے پوچھا: "اس پنکھے پر یہ کیا عبارت لکھی ہے؟"

میں نے کہا: "جانِ من! میں اسے پڑھ تو نہیں سکتا۔ لیکن سُونگھ سکتا ہوں۔" پھر چینی پنکھے کو زور سے سونگھتے ہوئے کہا: ہائے! مجھے تو یہ محبت کی کہانی معلوم ہوتی ہے!"

سریتا بولی: "جب تک دھار لیک پر تمہارے دھرم پال آنند کے گھر پہنچتے ہیں، آؤ اس محبت کی کہانی کو پڑھ جائیں۔ میں عورت بنتی ہوں تم مرد بن جاؤ!"

"بن جاؤ کا کیا مطلب؟ میں تو مرد ہوں۔ جیسے تم عورت ہو!"

سریتا نے لکڑی کے خوش نما دستوں پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا:

"یہ عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے یا بائیں سے دائیں؟"

"اوپر سے نیچے" میں نے آہستہ سے کہا: "یہ محبت کی کہانی ہے نا ۔"

سر تیا ہنسی ہنس کر اس نے اپنی انگلی عورت کی تصویر کے نیچے لکھی ہوئی عبارت پر رکھی اور اُسے نیچے گھماتے ہوئے بولی :

"میں می ماؤ
فاؤ چانگ علاقے کی عورت
تنگ کے پیڑ کے نیچے
جھیل کے کنارے تیرا انتظار کرتی ہوں "

میں نے مرد کی تصویر کے نیچے اُنگلی گھماتے ہوئے کہا :

"میں کو آتنگ پہاڑوں کا مرد
اپنی یخ بستہ چوٹیوں سے اُتر کر
جھیل کے جنگلوں سے گذرتا ہوا
رواں دواں ندیوں سے کھیلتا ہوا
جھیل کے اس کنارے پہونچتا ہوں
جہاں تو کھڑی ہے !"

"تم کیوں آئے ہو مرد ؟"
"تم یہاں کیوں کھڑی ہو عورت ؟"
"میں جھیل میں اپنی تیرتی ہوئی بطخوں کا رقص دیکھتی ہوں "
"اور میں جھیل میں تیرتے ہوئے تیرے چہرے کا عکس دیکھتا ہوں !"

سریتا بولی "فائوچانگ میں اخروٹ شہد کی طرح میٹھے ہیں
اور چاول کے دانے عورت کی انگلیوں کے پوروں کی طرح نازک
اور حسین ہیں۔
فائوچانگ کی جھیل کے جتنے نغمے ہیں
وہ موسمِ بہار میں تنگ کے درختوں پر سُرخ پھول بن کر کھل
جاتے ہیں،
فائوچانگ کے علاقے کی عورت اپنے گھر میں مطمئن ہے
اجنبی! اس جھیل کا عکس نہ دیکھ!"
میں نے کہا "میرے کوانگ کے پہاڑوں پر سدا برف رہتی ہے
طوفان کے جھکڑ چلتے ہیں
وہاں سرد چٹانیں ہیں اور ننگے نوکیلے پتھر۔
میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے
نہ اخروٹ، نہ چاول، نہ جھیل، نہ نغمے،
پھر بھی میں ماؤ میں تیرا عکس دیکھتا ہوں
کیوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے!"
سریتا نے کہا:
"اے اجنبی!

میں تیرے لئے کواتنگ کے برفیلے پہاڑ پر جاؤں گی
اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کروں گی۔
سرد چٹانوں پر رہوں گی
اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی
اور تنگ کے سرخ پھولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی
کیوں کہ میں عورت ہوں !"

یکایک سریتا نے دستی پنکھا بند کر کے اپنی گود میں گرا دیا، اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کے رونے لگی ——!

روتے روتے سریتا اور بھی دلکش ہوگئی۔ اس کے رخسار جذبات کی سرخی سے تمتمانے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے شفق کی دھاریوں کی طرح چمکنے لگے۔ اور بھیگی پلکوں پر آنسو شبنم کے موتیوں کی طرح جگمگانے لگے۔

میں نے اسے سہارا دے کر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ آنسوؤں کے دھارے میں عورت کتنی کمزور اور ملائم ہو جاتی ہے۔ جیسے بارش میں بھیگ بھیگ کر دھرتی نرم پڑ جاتی ہے۔ اس وقت عورت کی کمزوری ایک عجیب

خطرناک کیفیت بھی ہو جاتی ہے جس سے بچاؤ کی صورت مشکل سے سوجھتی ہے۔ میں تو روتی ہوئی عورت اور مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اسے پیار کئے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ ایسا احمق ہوں!"

میں نے سریتا سے پوچھا "کچھ یاد آیا؟"

"ہرگز یاد آیا" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تم عورتوں میں بس یہی خامی ہے" میں ذرا غصے سے بولا۔ "ایسے نفسیاتی موقعے پر رو دیتی ہو کہ آدمی بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے دیکھو، اچھا بھلا اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ تمہیں کسی طرح پریشان نہیں کر رہا تھا، لیکن تم نے اپنی حرکت سے میرا زہد غارت کر دیا۔ بس اسی لئے مجھے تم عورتوں سے نفرت ہے!"

میں اس سے الگ ہو کے بیٹھ گیا۔ سچ مچ مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔

سریتا مسکرا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے پوچھا: "تم نے بی اے کیا ہے؟"

وہ بولی: "بی اے کیا ہے۔ اس کے بعد لا بھی کیا ہے!"

"لا کیا ہے تو وکیل کیوں نہ بن گئیں؟"

"اس دنیا میں انصاف کہاں ہے؟" سریتا نے جواب دیا۔

"انصاف نہ سہی، وکالت میں تمہیں عزت تو ملتی!"

"اس دنیا میں وہ عورت بڑی خوش قسمت ہوتی ہے جسے عزت ملتی ہے!"

"اچھا چلو عزت نہ سہی پیسے ہی ملتے۔ اس بیرہ گیری سے تو زیادہ ہی ملتے!"

"کیا بات کرتے ہو مسٹر! —— تمہیں کچھ پتہ ہے؟" سرتیا غصے سے بولی —"اس بیرہ گیری میں معمولی سے معمولی طالب علم بھی کافی پیسے آتا ہے تو مجھے ایک روپے سے کم کا ٹپ نہیں دیتا —— ایک صاحب ہیں، وہ جب آتے ہیں پانچ روپے کا ٹپ دے کر جاتے ہیں۔ چاہے بل چھ آنے کا ہو —— ایک بزنس مین ہے وہ گذشتہ پندرہ روز سے رات کو ڈنر کھانے آتا ہے اور سو روپے کا ٹپ میرے ہاتھ میں ہر روز تھما جاتا ہے۔ ہر روز شام کے وقت اس کی گاڑی باہر میرا انتظار کرتی ہے۔ آج پندرہ روز ہو گئے!"

"پھر ——؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی دو چار مہینے اس کی گاڑی اور انتظار کرے گی۔" وہ بڑی نخوت سے بولی "میں تم مردوں سے گن گن کر انتقام لوں گی!"

"اب تک کتنے انتقام گن چکی ہو؟"

میں نے اُس سے پوچھا!

حملہ بہت تیز تھا۔ اس کے لئے اُس نے زور کا دھپ میری پیٹھ پر مارا۔ پھر ایک اور دیا پھر ایک اور ––– میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ جب جا کے وہ کہیں رکی۔ اس دَوران میں اس نے مجھے بہت سی بے ضرر قسم کی گالیاں بھی دیں، جنہیں میں نے ہنس کر سُن لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی: "سونے کے علاوہ کیا عورتیں بھی تم اسمگل کرتے ہو؟"

میں نے کہا: "ہر قیمتی چیز اسمگل ہوتی ہے۔ چاہو تو میں تمہیں اسی گاڑی سے جادو کے تماشے کے پتے کی طرح غائب کر دوں، اور صبح جب تمہاری آنکھ کھلے تو تم اپنے آپ کو بغداد کے کسی کوچے میں روم کے کسی پیازا میں یا بیونس ایرز کے کسی کمرے میں پاؤگی۔"

"ہُوں!" میں نے چٹکی بجائی۔

"نہ بابا!" ––– سریتا نے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں!"

گاڑی اب پہاڑ کی پڑھائی چڑھتے ہوئے اُدھر جا رہی تھی جہاں میرے دوست آنند کا گھر تھا۔ میں نے سوئچ دبا کر گاڑی کے اندر روشنی کی اور سریتا سے کہا ––– "پف پاؤڈر کے الم غلم سے اپنے چہرے کی مرمت

کرلو۔ آنند کا گھر قریب آرہا ہے"۔
سریتا نے کیبکیٹ کھولا۔

بنگلے کے پورٹیکو میں ہمیں آنند کا بیرا مل گیا۔ اس سے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ آنند کی بیوی تو گھر میں نہیں ہیں۔ وہ، لکھ پتی فلم ایکٹریس تاج بیں کسی پارٹی میں شامل ہونے کے لئے شام ہی سے غائب ہے۔

"اور وہ نکھٹو کہاں ہے؟" میں نے بیرے سے پوچھا۔

"کوئی نکھٹو صاحب اِدھر نہیں آئے"۔ بیرے نے حیرانی سے جواب دیا۔

"ارے وہ لال بجھکڑ آنند کو میں پوچھتا ہوں"۔

"آنند صاحب تو اپنے بیڈروم میں ہیں!"

"کیا کررہے ہیں؟"

"وہسکی پی رہے ہیں!"

میں نے سریتا کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا: "جلدی چلو سریتا ورنہ وہ کم بخت ساری بوتل ختم کر جائے گا!"

خوش رُو، خوش اخلاق، خوش نصیب آنند اپنے کمرے میں اکیلا وہسکی پی رہا تھا۔ جب ہم اطلاع دیئے بغیر اس کے کمرے میں پہونچے، تو

وہ اپنا پیگ بنا کر اسے ہونٹوں تک لے جانے والا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹکا، چونکا، اور اس کا گلاس یکایک اس کے ہاتھوں سے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

میں نے ہنس کر کہا "ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو میں تمہارا دوست ہوں جیون! ـــــ جیون۔ کوئی بھوت نہیں ہوں!"

اس نے آہستہ سے کہا۔" ایک لمحے کے لئے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ میں کسی بھوت یا چھلاوے کو دیکھ رہا ہوں!"

میں نے تعارف کرایا ـــ" یہ سریتا ہیں! ـــ یہ آنند ہیں!"

آنند نے رک رک کر آہستہ سے پوچھا ـــ" یہ ـــ یہ تمہاری بیوی ہیں؟"

سریتا بڑی تیزی سے بولی: "نہیں صاحب! ـــ میں ان کی محبوبہ ہوں! ایک رات کی محبوبہ!!"

اس کے بعد وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی، اور بولی ـــ "ایک پیگ بنا لیجئے!"

رات مدھم اور ملائم یوں دھیرے دھیرے گذر رہی تھی جیسے وسکی حلق سے گذرتی ہے۔ اس رات میں پرانے پھولوں کی خوشبو تھی، اور

ایک افسردہ نشہ تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے اپنے اپنے خیالوں میں گم، اور اپنے اپنے پیالوں میں کھوئے ہوئے، اور اپنے اپنے سپنوں میں سوئے ہوئے۔

یکایک سریتا نے چونک کر کہا۔ "وہسکی ختم ہوگئی!"

آنند نے اٹھ کر دوسری بوتل نکالی۔

سریتا بولی: "اس بیڈروم میں بڑی گھٹن ہے، کہیں باہر کیوں نہ چلیں؟"

ہم لوگ وہسکی لئے باہر آ گئے، اور بنگلے کی مغربی سیڑھیوں پر جا بیٹھ گئے۔ میں اور سریتا پاس پاس بیٹھے۔ آنند ہم سے نیچے پتھر کے زینے پر یوں بیٹھا جہاں وہ ہم دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ سامنے سبز نوکیلے بانسوں کا جھنڈ چینی پنکھے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ بانسوں کے جھنڈ سے پرے ڈھلوان باغ تھا۔ جس کے نادیدہ پھولوں کی بھینی بھینی مہک ہمارے احساس میں گھلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں چاند آئے گا!" آنند نے آہستہ سے کہا اور چپ ہوگیا۔

کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

ایک لمبے وقفے کے بعد سریتا نے پوچھا: "آپ کی اہلیہ محترمہ

اب تک نہیں آئیں؟"

"وہ دیر میں آتی ہیں!"

"اور کبھی کبھی نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پوچھا۔

آنند نے اثبات میں سر ہلا دیا: "ہاں کبھی کبھی نہیں آتی ہیں۔"

"کیوں نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پھر پوچھا: "فلم لائن سے تو مدت ہوئی وہ کنارہ کش ہو چکیں۔ اب کہاں جاتی ہیں؟"

"جانے وہ کہاں جاتی ہیں؟ لیکن یہ مجھے وہسکی دے جاتی ہیں، یہ بنگلہ دے جاتی ہیں، کار دے جاتی ہیں۔"

"تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟"

آنند نے ایک بہت بڑا گھونٹ پی کر کہا: "بہت مدت ہوئی، یہ سوال میرے سامنے آیا تھا: خوشی یا دولت؟ — میں نے دولت کو چن لیا۔ مجھے شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تم انسان ہو کہ سوٗر؟" یکایک سریتا چیخ اٹھی۔

آنند وہسکی سے بھرا ہوا گلاس اس کے منہ پر مارنے والا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آدھی سے زیادہ وہسکی میرے ہاتھ پر چھلک گئی —

آنند پیچھے ہٹ گیا، اور ہماری طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا۔

میں نے سریتا سے کہا: "یہ تمہاری انتہائی بدتمیزی ہے۔ شراب کے نشے میں تم اپنے آپ کو بھولتی جا رہی ہو!"

"بھولنا چاہتی ہوں، مگر بھول نہیں سکتی!"

"آنند سے معافی مانگو!"

یکایک آنند اُٹھ بیٹھا۔ بڑی سختی سے بولا: "نہیں نہیں، معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے میں جا رہا ہوں۔ آج کی رات کے لئے یہ گھر تمہارے حوالے ہے۔"

اس نے گلاس ختم کر کے گلاس کو بانسوں کے جھنڈ میں پھینک دیا۔ اور جلدی سے چلا گیا۔

میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں رُکا۔

تھوڑی دیر میں اُس کی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

سریتا ہولے ہولے ہنسنے لگی۔

میں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اور مت پیو، تم ہوش میں نہیں ہو!"

آنند کی کار نیچے ڈھلوان سڑک پر اترتی جا رہی تھی۔ کار کی پشت کی سُرخ بتیاں کبھی درختوں میں چھپتیں، کبھی سڑک پر چمکتی نظر آ رہی تھیں —— پھر بتیاں دور چلی گئیں —— پھر بتیاں گم ہو گئیں۔

پھر سڑک پر اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔

سرتیا گھٹنوں میں منہ چھپا کے دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

یکایک نیم چاند بانسوں کے جھنڈ سے ابھر آیا، اور بانس کی ایک شاخ کا سہارا لے کر سرتیا کی طرف حیران و پریشان دیکھنے لگا۔

یکایک سرتیا نے سر اٹھایا، اور چاند کو شربیا نگاہوں سے دیکھ کر بولی:

"کیا دیکھتے ہو میری طرف؟ میری ہنسی اڑاتے ہو سالے دھوکے باز جھوٹے فریبی چاند؟"

سرتیا نے گلاس کھینچ کر چاند کے منہ پر مارا۔ گلاس بانسوں کے جھنڈ میں جا گرا۔ ایک چھناکے سے اس کے ٹوٹنے کی آواز آئی، شاخیں اپنی جگہ پر ہلیں، پھر ساکت ہو گئیں۔

سرتیا گلوگیر آواز میں بولی:

"کہیں کچھ ٹوٹتا ہے۔ پھر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ شاخیں ہلتی ہیں پھر بھی اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتی ہیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ نشے میں اس کا منہ کھلا تھا، اور اس کا سارا جسم بانس کی ٹہنی کی طرح کانپ رہا تھا۔

بیڈروم کے قریب پہونچ کر وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکل گئی اور میری طرف انگلی اٹھا کے بولی :

"میں اِس بیڈروم میں سوؤں گی، تم اُس بیڈروم میں !"

"کیوں ؟"

"میں آج رات اپنے غم کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں ۔"

"تمہارا غم کیا ہے ؟"

"تمہیں کیوں بتاؤں، تم میرے کون ہوتے ہو؟"

میں نے کہا : "میں تو اِس بیڈروم میں سوؤں گا !"

سرتیا نے شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا : "اگر تم انسان ہو تو دوسرے بیڈروم میں جا کر سو جاؤ گے، اور اگر شوہر ہو تو میرے کمرے میں آؤ گے ۔"

اتنا کہہ کر سرتیا نے جلدی سے اپنے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میں دھیرے دھیرے دوسرے بیڈروم میں جانے لگا۔

صبح ہوئی تو سرتیا جا چکی تھی ۔

ٹیبل پر ایک خط پڑا تھا — خط پر چینی پنکھا رکھا تھا — میں نے خط اُٹھایا — لکھا تھا:

" میں نے سوچا تھا، میں سب کچھ بھول چکی ہوں لیکن عورت بھلانے پر بھی کچھ بھول نہیں سکتی۔ ہر زخم اس کی رُوح میں ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ سدا رستا رہتا ہے — آنند میرا شوہر ہے اُس نے محبت کو تج دیا، اور دولت سے شادی کر لی — آج میں اس سے انتقام لینے آئی تھی۔ لیکن عین وقت پر میرے اندر کی عورت نے میرا ساتھ نہ دیا — میرے خریدار! میں تجھ سے معافی مانگتی ہوں!

میں بمبئی سے بہت دُور جا رہی ہوں — ایک چھوٹے سے دور افتادہ شہر میں میرا ایک بچہ پل رہا ہے میرا اور آنند کا بچہ! میں اس کے پاس جا رہی ہوں!

سریتا "

کئی برس گزر گئے، وہ چینی پنکھا آج بھی میرے پاس ہے اُسے کھولتا ہوں تو اس میں سے آج بھی ایک اَن جانی سی مہک آتی ہے۔

پھر تیز اور سرد اور طوفانی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، اور کوئی بڑی دل دوز، گہری اور گمبھیر آواز میں مجھ سے کہتا ہے:

"اے اجنبی!

میں تیرے لئے،

کواتنگ کے برفیلے پہاڑوں پر جاؤں گی

اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کروں گی۔

سرد چٹانوں میں رہوں گی۔

اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی۔

اور تنگ کے سُرخ پھولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی۔

کیوں کہ میں عورت ہوں!"

موہن جو دارو کا خزانہ

موہن جوداڑو کے سب ٹیلے کھودے جا چکے تھے سوائے ایک کے'
موہن جو دارو کے ٹیلوں کا سینہ چیر کے انسانی ہاتھوں نے پانچ
ہزار سال پرانی تہذیب کے سارے عناصر سمیٹ لئے تھے۔
کتبے، صراحیاں، کھلونے، حمام، چکیاں، اصطبل، فصیلیں، حصار'
گودام، غلام گردشیں (غلام ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ آج بھی' آج سے
پانچ ہزار سال پہلے بھی) کپڑا، رنگ، ظروف، مٹی کے تابوت، وزن کے
سیر، پاؤ، چھٹانک۔ کھودنے والوں نے سب کچھ نکال لیا تھا۔ مگر جو وہ چاہتے
تھے وہ انہیں نہیں ملا۔

کھودنے میں کامیابی یا ناکامی دونوں ممکن ہیں۔ زمین کھودنے پر

اپنے سارے خزانے اگل دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی انسان اپنی خواہشوں کو اس میں سے کھودتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اور پھر زمین کو گالی دیتا ہے۔ اس میں زمین کا کیا قصور؟

یُوں تو زمین نے انسان کی ہر خواہش کو پورا کیا ہے ——— لیکن اپنے طریقے سے۔

کیوں کہ زمین ایک عشوہ طراز محبوبہ ہے! ——— لیکن بہت سے لوگ اسے محض مٹی سمجھتے ہیں!! ——— اور اس طرح اپنی خواہش کو مٹی میں ملا دیتے ہیں!!!

انجینئروں اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ماہروں کی کانفرنس بلائی جارہی تھی۔ ایک گنجے سر والا یورو پین تھا۔ ڈیوڈ ——— یوربین، اور فلاسفر اور یہودی ——— دوسرا سانولے رنگ کا دُبلا پتلا مسلمان تھا۔ اطہر ——— اُسے ہر وقت مٹی کے کتبے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اگر مٹی کے ڈھیر سے نکالتے

وقت کوئی کتبہ یا حروف کی مہر یا اینٹ بیچ میں سے ٹوٹ جاتی، تو وہ ایسے آبدیدہ ہوجاتا جیسے کسی نے اس کے دل پر پاؤں رکھ دیا ہو — تیسرا موجدار ایک بنگالی ہندو تھا۔ سیاہ فام اور کوتاہ قد۔ لیکن اپنے ذہن میں علم وفضل کے سمندر سمیٹے ہوئے تھا۔ مصر کا آخری اہرام اُس کے سامنے ہی کھولا گیا تھا۔ فرات کی وادیوں میں نینوہ کی ملکہ کا بُت اُسی نے دریافت کیا تھا — چوتھا میں تھا — میں جو ماضی کا پچھتاوا ہوں اور مستقبل کی بازگشت — لیکن وہ مجھے صرف سُن سکتے تھے، دیکھ نہیں سکتے تھے۔

موجدار نے کہا "اب صرف آخری ٹیلہ رہ گیا ہے کھودنے کے لئے سمجھ میں نہیں آتا، اتنے بڑے شہر کے خزانے کو کیا ہوا — عورتوں کے سونے کے زیور تو کہیں کہیں ملے ہیں، مگر بے حد معمولی - ان میں سے کسی میں ہیرے یا جواہرات بھی ٹکے ہوئے ہیں، لیکن بے حد معمولی اور چھوٹے اور گھٹیا قسم کے — اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سونا دریافت ہوچکا تھا — اور ہیرے جواہرات بھی — پھر شہر کا خزانہ کدھر گیا؟"

میں نے کہا: "ہوسکتا ہے، اپنے وقت کا کوئی نادر شاہ اس زمانے میں بھی رہا ہو۔ وہ اس شہر کے سارے خزانے لوٹ کر چلتا بنا ہو!"

لیکن ان لوگوں نے میری بات کی پروا نہ کی۔

اطہر نے کہا، "لاتعداد اَن گنت کتبے ملے ہیں، مگر کسی ٹیلے پر سے وہ مہر نہیں ملی جو موہن جوداڑو کی زبان کی کلید ثابت ہوتی ــــ اس کلید کے دریافت نہ ہونے سے ہماری تہذیب دنیا کی سب سے پرانی زبان کے بیش قیمت ورثے سے محروم ہو جائے گی!"

میں نے کہا ــــ "مُردہ زبانوں کو ڈھونڈنے والے! آج تیرے سامنے جو زندہ زبانوں کو قتل کیا جا رہا ہے، اُس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

لیکن اطہر نے اس طرح اپنا کندھا ہلا دیا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سُنی ہو۔

ڈیوڈ بولا ــــ "خزانہ نہ ملے، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ آخر کون سا یہ خزانہ ہم اپنے گھر لے جا سکیں گے۔ زبان کی کنجی بھی نہیں ملتی نہ ملے۔ آخر یہ زبان آج کل کے زمانے کے کس کام کی؟ ہم اپنے بچوں کو اس زبان میں تعلیم دینے سے تو رہے! ــــ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اتنے ٹیلے ہم نے کھود ڈالے۔ سارے موہن جوداڑو کی بنیادیں تک ہم نے ہلا دیں، لیکن آج تک وہ مٹی کا خدا نہ ملا جسے یہ لوگ پُوجتے تھے ــــ ہر تہذیب کے لئے کسی نہ کسی خدا کا تصور ضروری ہوتا ہے ــــ

موہن جوداڑو کے لوگ کس خدا کو پوجتے تھے؟ یہ راز کسی ٹیلے کو کھودنے سے ہم پر ظاہر نہ ہوا !! "

میں نے کہا: " شاید اس راز کو ڈھونڈنے کے لئے تمہیں کسی ٹیلے کو کھودنے کی ضرورت نہ تھی، ذرا سا اپنے دل کو کھود لیتے "۔

ڈیوڈ نے غصے سے سامنے کی دیوار کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کے خیال میں ـــ میں مکڑی کے ایک جالے میں لٹکا ہوا تھا ـــ پھر اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی، باہر ایک نیم ریتیلے میدان میں ایک بوڑھا گڈریا بھیڑیں چرا رہا تھا۔

ڈیوڈ نے کہا ـــ" ایک روز یہ بوڑھا گڈریا مجھ سے کہتا تھا ـــ کہ موہن جوداڑو کا سب سے بیش قیمت خزانہ اس بڑے ٹیلے میں دفن ہے "۔

میں نے پوچھا: " اس ٹیلے میں جواب تک کھودا نہیں گیا؟ "

کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سب اپنے اپنے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ڈیوڈ نے کہا: " کل رات کو ہم تینوں مل کر موہن جوداڑو کے آخری ٹیلے کو کھودیں گے اس میں سے .... جب مزدور کام کر کے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے! "

اطہر بولا: " شاید موہن جوداڑو کی زبان کی کنجی مل جائے "۔

موجیدار بولا: "شاید موہن جوداڑو کا خزانہ مل جائے!"

ڈیوڈ بولا: "شاید موہن جوداڑو کا خدا مل جائے!"

تینوں نے مل کر اس اونچے ٹیلے کی طرف دیکھا جس کے سایوں میں وہ گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہے۔

رات کے تیسرے پہر تک وہ لوگ ــــ وہ تینوں مل کر زمین کھودتے رہے ــــ زمین کھودتے رہے ــــ زمین بھربھری اور ریتیلی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنا اونچا ٹیلہ ہوتا ہے، اتنا ہی کھس بھرا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اب تک اس ٹیلے میں سے کوئی کام کی چیز نہ نکلی تھی ــــ مٹی کا ایک کنبہ، بچوں کا ایک کھلونا، عورتوں کا ایک زیور، موت کا ایک تابوت، کچھ بھی تو اس ٹیلے میں سے نہ نکلا۔ بس ریت ہی ریت تھی!

"وہ گڈریا بکواس کرتا تھا!" ڈیوڈ نے جھلا کر کہا۔

موجمدار نے کہا۔" قیمتی چیز سب سے آخر میں ملتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ سب سے بیش قیمت شے سب سے محفوظ جگہ چھپا کے رکھتا ہے۔"

"اب ہم ٹیلے کے آخر تک آن پہونچے ہیں،" اطہر نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔" مگر اب تک ریت کے سوا اس میں کچھ نہیں ملا۔"

اُس کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

میں نے کہا۔" مگر پانچ ہزار سال پرانی ریت کو تو دیکھو ــــ اُس کے ذرّے ذرّے میں کتنی پرانی کہانیوں کی مہک ہے...... اس ریت سے کانچ کی چوڑی بنی تھی، جسے موہن جوداڑو کی عورت نے اپنی نازک کلائی میں پہنا تھا ــــ اس ریت میں موہن جوداڑو کے بچّوں نے مٹّی کے گھروندے بنائے تھے ــــ اس ریت میں آج سے پانچ ہزار برس پہلے کسی عاشق کا تابوت گاڑا گیا تھا..... ذرا سونگھو تو اس ریت کو ــــ سنو، یہ پانچ ہزار برس پرانی مہک کیا کہتی ہے؟ کیا کیا سُناتی ہے؟ کس کس طرح فریاد کرتی ہے؟"

عین اسی وقت موجمدار کی کُدال دھات کے کسی برتن سے ٹکرائی اور موجمدار کدال چھوڑ کر وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ اس کا دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔

"سنبھال کے ـــ سنبھال کے ....." ڈیوڈ نے اسے تہدیدی انداز میں کہا۔ اور خود بھی موجدار کے قریب بیٹھ گیا۔

تیسری طرف سے اطہر بھی آکے اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ چوتھی طرف میں بیٹھا تھا۔ لیکن وہ مجھے دیکھ نہ سکتے تھے۔ صرف میرے قریب رکھے ہوئے گیس لیمپ کی اُجلی اُجلی روشنی دیکھ سکتے تھے!

اُن تینوں نے ہاتھوں سے بلکہ ناخنوں سے کرید کرید کر دھات کے اُس برتن کو نکالا۔ ڈیوڈ نے جھاڑ پونچھ کر اسے اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر گیس کی روشنی میں دیکھا۔

موجدار خوشی سے چلّا کر بولا۔ "یہ تو سونے کی صندوقچی ہے"

واقعی یہ سونے کی ایک خوب صورت صندوقچی تھی ـــ جس پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے، اور موہن جوداڑو کی قدیم زبان کے حروف کندہ تھے، اور عجیب و غریب دیوی دیوتاؤں کی تصویریں کھدی تھیں۔

موجدار نے چلّا کے کہا "یہی وہ ہے۔ موہن جوداڑو کے شہر کا بیش قیمت خزانہ، یاقوت، نیلم و مرجان سے بھرا ہوا"

اطہر بولا " اس میں موہن جوداڑو کی زبان کی کنجی ہے! یہ باہر کے

کندہ کئے گئے حروف تو دیکھو!"

ڈیوڈ بولا "اس میں موہن جوداروکا خدا ہے — دیوی دیوتاؤں کی عجیب و غریب تصویریں اس مقدس صندوقچی کی حفاظت کررہی ہیں۔ یہ دیکھو — یہ دیکھو۔"

"کھولو۔ کھولو۔" موجدار نے بڑی بے تابی سے کہا "اس صندوقچی کو جلدی سے کھولو۔"

صندوقچی میں کبھی سونے کا تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کو تالا کھولنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہروں اور نقب زنوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس لئے تالا بہت جلدی کھول لیا گیا۔

لیکن ڈیوڈ کا دل ڈھکنے کو کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ ان آخری لمحوں میں ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔ اور بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تھیٹر کا پردہ اُٹھنے والا ہو۔

موجدار نے کہا "ڈھکنا اُٹھاؤ۔ ڈیوڈ! جلدی سے ڈھکنا اٹھاؤ۔"

ڈیوڈ پھر ہچکچایا۔

اطہر نے آگے بڑھ کے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

خدا کے لئے ڈیوڈ۔

اندر ایک گول گول سیاہ سی چیز پڑی تھی۔ ڈیوڈ نے اسے بڑی احتیاط سے اُٹھایا، سونگھا، اور پھر بڑی مایوسی سے کہا۔

"ارے! یہ تو ایک روٹی ہے!"

"روٹی؟" موجیدار مایوسی سے چلّایا۔

میں نے کہا۔ "ہاں روٹی! دنیا کا سب سے بیش قیمت خزانہ۔"

اطہر نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "روٹی؟"

میں نے کہا: "روٹی! جوہر زبان کی کنجی ہے۔"

ڈیوڈ کا سر نا امیدی سے اپنے سینے پر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے بولا "صرف ایک روٹی؟"

میں نے کہا "روٹی! جو ساری تہذیبوں کی خدا ہے!"

لیکن امید و بیم کی پہلی کش مکش میں انہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ان تینوں نے باری باری سے اس روٹی کو اٹھا کر دیکھا — ہاں روٹی تھی — اناج کی روٹی تھی — آگ پر پکی ہوئی روٹی تھی اور — صرف ایک روٹی تھی۔

ڈیوڈ نے اس روٹی کو ہاتھ میں لیا۔ اور غصّے سے بولا "کدھر ہے وہ گڈریا، جو کہتا تھا: موہن جوداڑو کے آخری ٹیلے میں اس کا سب سے بیش قیمت خزانہ دفن ہے۔"؟

تینوں نے مل کر اس سمت دیکھا، جدھر گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہو۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہو۔ اس روٹی کے لئے جو انسان کی پہلی خوشی ہے ــــ اور اس کا آخری غم ہے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جہاں پر گڈریا تھا، وہاں پر اب صرف ایک صلیب ہے!

پھر یکایک صلیب کے پیچھے سے آفتاب نکل آیا ــــ اور اس کی سنہری کرنوں میں وہ روٹی یکایک سونے کے ایک تھال کی طرح چمک اٹھی، اور یکایک ان تینوں کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ اور موجدار نے ڈیوڈ سے کچھ اشارہ کر کے کہا۔ "اس روٹی کو چھپا لو۔ اس روٹی کو چھپا لو مزدور کام پر واپس آ رہے ہیں!"

ڈیوڈ نے گھبرا کر جلدی سے اپنے دامن میں چھپا لیا، اور افق کی طرف دیکھا ــــ

افق پر واقعی صبح ہو چکی تھی، اور مزدور کدالیں اٹھائے اپنے کام پر واپس آ رہے تھے!

پرتو

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا، تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پُر وقار تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا رنگ سُرخ و سفید، براق نورانی داڑھی۔ اس نے کالی سرج کے رنگ کا اونی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر مونگیا رنگ کی پگڑی کس کر باندھی ہوئی تھی۔ اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اُٹھتے تھے ــــ وہ سیدھا چلتا ہوا، متوازن قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ کر رُکا۔ جُھک کر اُس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا، اور اطمینان کی سانس لیکر

سیٹ پر دراز ہوگیا۔ سیٹ اس کے وزن سے پیچھے کو ہوگئی۔ اُس نے مزید اطمینان کی سانس لی، اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلدار نشستیں بہت عمدہ ہیں!"

میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا، جلدی سے خاکدان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا، اور اُس نے کہا۔

"شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے!"

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ بے حد سپید اور مضبوط دانت، جُڑے جُڑے اور ہم سطح۔ اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔

اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اس کے رخساروں پر

تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی۔ اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی وی (V) کا سا نشان بنائے ہوئے تھے۔ اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھ اوپر کئے تو میں نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی ایسے چھوٹے چھوٹے زخموں کے بیسیوں نشان ہیں ــــ جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے اِن ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

"جنگ!" میں نے اپنے دل میں سوچا "جانے پہلی جنگِ عظیم کے کس محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ اس خوبرو اور وجیہہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں گئی، ورنہ کتنا بُرا معلوم ہوتا یہ آدمی!"

مجھے اس معاملے پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ریسٹوران کا رکے بیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آ کے کھانا کھا لیں۔ ہم لوگ دس بجے ریسٹوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بوڑھا سکھ بھی میرے ساتھ اُٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کے چلا تھا ــــ مگر اس

وقت پھر بھوک محسوس کر رہا ہوں ۔۔۔" بوڑھا سکھ ہنس کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اور میں اس لئے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی!"
میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا، اور کھڑکی سے باہر رک رک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔۔۔

لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا، جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دبتے ہی لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اٹھتی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (Switch) ہے۔ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی ہے۔ لڑکی کے بال خوش نما طریق سے کٹے ہوئے تھے۔ اور وہ بڑی دلربا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی۔ اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی، جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔

لڑکا، خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا مرا اٹھا چھوٹا قد، لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا جسم، گھنے چمکیلے بال، اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اُس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے۔ اور اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں!

لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اور بار بار وہ اسے اس طرح دبا تا تھا جیسے وہ اس میں برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس لڑکی کی نیلی ساڑھی کا پلو برابر مسلے جا رہا تھا۔ اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں، جیسے وہ لڑکی، لڑکی نہ ہو، مٹن کی ایک پلیٹ ہو۔

"محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے!" میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیوں کہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا۔ اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر

اور بل ادا کر کے چلا گیا ۔ چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی ۔ اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ اس کے تبسم کی وہ ادا بے حد پسند آئی ۔ جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی تو کتنی چاہت اور سپردگی ہوتی تھی اس کی نگاہ میں ۔ کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے ۔ اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے ! بس اسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے ۔

مسکرانے کے بعد کچھ اسی طرح کی نگاہ سے اُس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا ۔ اور پھر کھٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا ۔ اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ویٹ بیول میں لے گیا تھا ۔ اور ان کے جانے کے بعد ریسٹوران کا اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی ۔ اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف اُنہیں کے لئے اٹکایا گیا تھا ۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا ۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا ۔ مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا ۔ کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگریٹ پینے کے لئے باہر ویٹ بیول میں آ گیا ۔

ویٹی بیول کے کونے میں وہ نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا۔
اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا ——— اور اس کی آنکھوں سے آنسو
بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا "یہ آنسو کیسے؟"

"یونہی یونہی!" لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔
اور پھر کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ اور اس کے چہرے پر وہی دل آویز
تبسم آیا، من موہنا، محبت میں ڈوبا ہوا، گلنار تبسم!

لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اس نے ٹھٹھر کے کہا۔ "چلو ڈارلنگ
اندر چلیں۔ یہاں سردی ہے! اور...."

اُس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اشارہ
کیا۔

میں دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پورنیما کے چاند کو دیکھ
رہا تھا۔ لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا، گویا مجھے کچا کھا
جائے گا۔

پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے
ویٹی بیول سے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا سکھ بھی کافی پی کر ریستوران کار سے نکلا۔ میں نے بھی اتنے میں سگریٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے ڈبے میں آ کر اپنی سیٹوں پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا۔ اس نے سب بتیاں بجھا دیں۔ لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی۔ اور اس کی سپید مدھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور سہمے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا "مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں؟"

"ذرا ٹھہرو!" ــــ بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجے میں بے حد پرسوز آواز میں کہا ــــ "یہ پونم کی رات بہت بھیانک ہے۔ بہت خوب صورت بھی ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ مگر اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں؟"

"چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔" میں نے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔

بوڑھا سکھ مسکرایا۔ اس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا، اور

صلیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رخسار کی وہی تاریکی میں گم تھی۔ (۷)

میں نے کہا: "تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کئے ہیں؟"

"جنگ؟" ___ بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں! جنگ ہی تو تھی" وہ رک کر آہستہ سے بولا۔

"کونسی جنگ؟ ___ پہلی جنگِ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا ___" بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا۔

میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا۔ اس لئے میری دلچسپی بڑھ گئی میں نے پوچھا: "پھر یہ زخم کیسے؟"

بوڑھے سکھ نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے۔ مگر جہاں تھے، وہیں کے وہیں اپنی اپنی آرام کرسیوں پر دراز سو رہے تھے۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر ڈبے کے آخر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا

اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا۔ اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر۔ آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے پوچھا: "یہ قصہ ضرور سنو گے؟"

"اگر تمہیں نیند نہ آ رہی ہو تو سنا دو۔"

"نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہ آئے گی!!" بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔

پھر اس نے اس طرح میری طرف دیکھا، جیسے وہ قصہ سنانے کے لئے تیار ہو چکا ہو۔ اور پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔

"اچھا تو سن لو۔ تم میرے لئے مکمل اجنبی ہو۔ اس لئے تمہیں سنا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔"

گاڑی کی کھڑکیوں میں دوہرے شیشے لگے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور گاڑی کے دو رویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹے ہوئے سر جھکائے ہوئے گناہ گار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے مراسکٹے نوجوان کی طرف

اشارہ کرکے کہا ــــ

"جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا ــ بے فکر اور لاپروا اور خود سر۔
میرا باپ گجندر سنگھ موضع ماصلاں کا نمبردار تھا۔ اور اس کے
علاوہ چیک نمبر ۳۷ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا۔ گھر
میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی اے پاس
کرایا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق
تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے ــــ
جانے میں نے بی اے کیسے کر لیا ــــ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں
فوج میں بھرتی ہو جاؤں ــــ کرنیل بنوں۔ مگر مجھے کھیتوں کی زندگی
ہی پسند تھی ــ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے
ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دھراں کے ٹیلے پر پانی
بھرتی ہوئی بانکی ناریوں کی قطار۔ اور میری سنہری گھوڑی کی دلکی چال،
کچے راستوں پر ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی ..... آہ!"

میں نے کہا "تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہو گے،
عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی۔"

بوڑھے سکھ نے ایک حزیں مسکراہٹ سے کہا ـــ "ایسا تو
مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی لڑکی نے مجھ سے محبت کی ہو۔ ہاں میں نے

ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی"۔

"کون تھی وہ؟"

"میری بیوی تھی!"

"بیوی؟ ——" میں نے بے حد ناامید ہو کر کہا۔ کم بخت نے سارے رومانس کا مزا کرکرا کر دیا تھا۔

"ہاں! جب میں بی اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھبراں کے نمبردار کی لڑکی پریتو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پریتو بڑی خوب صورت لڑکی تھی۔ لانبی اور بانکی، گوری اور سنہری، پھیکی اور نرم، جیسے کوار گندل —— مگر میں تو اُس کی آنکھوں پر مرتا تھا ——"

"کیوں؟ —— اُن آنکھوں میں کیا خاص بات تھی؟" میں نے پوچھا۔

"بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں، اور کالی سیاہ، مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں"۔

"پھر کیا بات تھی؟"

"کہہ نہیں سکتا، اُن آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں اُن آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا"۔

"وہ آنکھیں بولتی تھیں؟"

"بولتی تو نہیں تھیں، لیکن بولنا چاہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے... مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کہتی کچھ نہیں تھیں۔ ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں، جو ہر وقت سپنا دیکھا کریں؟"

"جوانی میں سبھی آنکھیں سپنا دیکھتی ہیں!" میں نے کہا۔

"ہاں! لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔!" بڈھے نے آہستہ سے کہا، میں تو اپنی پریتو پر مرمٹا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لئے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی عورت نہیں آئی تھی ـــــ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد ـــــ پریتو تم نے نہیں دیکھی، ورنہ یوں نہ کہتے۔ وہ تو ایسی عورت تھی، جس سے اس کے بیوی ہونے کے بعد بھی عشق کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر یوں ہی ہوا، جب میں گاؤں پہونچا، اور فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کر دیا، اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اُسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی

لڑائی میں اٹلی میں یا فرانس میں، میسوپوٹیمیا میں یا درۂ خیبر میں، کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی۔ حالانکہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا، وہ اچھا ہوا یا بُرا ہوا ـــــ" یکایک وہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا ـــــ "قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی پرتیو کو بہت چاہتا تھا۔ اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ اور ہم کبھی ایک دن کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسر اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور پرتیو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اس کا باپ بیمار تھا۔ اس لئے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا۔ چنانچہ پرتیو چلی گئی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کھیتوں میں، اپنی گھوڑسواری میں، کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے، لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سر پٹ ہو لیا ـــــ اپنی سسرال! ـــــ جک جھمراں ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے۔ لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار ہے۔ میں شام ہوتے ہوتے جک جھمراں پہونچ گیا۔

وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بلکہ میں نے انہیں خاصا ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے۔ تو وہ میری سعادت مندی پر بے حد خوش ہوئے۔

دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا، اس لئے جلدی کھانا کھا کے سو گیا۔ مجھے معلوم تھا اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی اٹھوں گا۔ میں نے پرتو سے کہا "مجھے صبح ضرور اٹھا دینا میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح سیر کو جاؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا ہی رہوں"!

لیکن ہوا یہ کہ اس رات تیسرے پہر ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے۔ دور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گذرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا:

'واھگورو، یہ کیا ماجرا ہے؟'

سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا، کرپان کو

تکئے کے نیچے سے نکال کر پہنا ۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہولیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی ۔ بڑی خوب صورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی ۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کر دیتیں، مگر ان کے چڑے فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونک کر انہیں اپنی گود میں دبا لیتے۔

میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے ۔ اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں ۔ اور میں کھیتوں میں گذرتا ہوا اپنی پرینو کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا : وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے جا رہی ہے ۔ لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کر لیا ——— دوسرے کھیت کو پار کر لیا ——— تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم کر نیچے کے خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی، تو مجھے کچھ عجیب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی ۔ دل کو دھچکا سا لگا۔

اور اب میں بہت ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اس کے تعاقب

میں چلنے لگا۔ تاکہ اسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔

تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اتر کر میں نے نالے کو پار کیا پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی ـــــ سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا ـــ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سایہ دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے نزدیک ایک ناپختہ گھر تھا۔ جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ میری پریتو، میری بیوی اس سے پیار کر رہی تھی۔ کتنی شدت تھی اس پیار میں!

میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ مگر میں چپکا بیریوں کی جھاڑ کے پیچھے کھڑا اُن لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا ـــ ہاں! ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا ـــ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے۔ اندر سے پانی لا دے!

پریتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹا لیا، اور بولی: پیجے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟ "

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اُس نے میری بیوی کے ہونٹ چُوم لئے۔

پرمیتو آہستہ سے پلنگ سے اٹھی، اور اَدھ کھلے دروازے سے نا پختہ مکان کے اندر گئی۔

بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیوں کہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکایک میں نے کرپان نکالی، اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے اوپر اٹھایا۔ اور پھر اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا بچنے کے منہ سے "ہک" کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہوگیا۔

پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالوں کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں سے گذرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لئے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا۔ اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی، تو اسے میان میں رکھ کر گھر آگیا۔ اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھے پون گھنٹے کے بعد پرمیتو میرے کمرے میں دھیرے

سے داخل ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

پرینو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے تکئے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اسے کھول کر دیکھا۔ اور جب اسے بالکل صاف شفاف پایا، تو گویا اس کے دل کا شبہ دور ہو گیا۔ اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی ـــــ چپ چاپ ـــــ پتھر کی مورتی ـــــ!"

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا! ـــــ اس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا، اس لئے میں پرینو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا ـــــ اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے، میں نے کبھی اس بات کا اس سے تذکرہ نہیں کیا۔ نہ پرینو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اسے کسی بات کا بھی شبہ ہوا تھا۔ یا اسے کسی بات کا غم تھا۔

ہاں! ایک بات ہیر نے ضرور کی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی ــــ میرے کہنے پر یا اپنے ماں باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعے کو بھول سا گیا۔ کیوں کہ اب ہمارے بچے ہو گئے تھے۔ میرے اور پریتو کے بچے ــــ دو لڑکے اور ایک لڑکی ــــ بڑے خوب صورت بچے تھے

ہمارے ــــ پرتاپ اور دلیپ اور ہرنام کور۔

بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ اور اسکول جانے لگے ــــ اسکول سے کالج میں جانے لگے۔

اور جب وہ کالج جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا ہربنس سنگھ۔

اب ہمارے ہرے بھرے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت۔ جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آکے مکھ کے

نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آگئے تھے۔ گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے ــــ ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرینو گھر کے نیچے ایک کونے میں چولہے میں مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ اُبل رہا تھا۔ اور اُس کی کھٹی کھٹی خوشبو میری بھوک کو اور بھی بے چین کر رہی تھی۔

میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھ دی۔ اور ہاتھ منہ دھو کر پرینو کے سامنے موڑھا بچھا کر بیٹھ گیا۔ اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

"پرینو! جلدی سے کھانا دے دے!"

پرینو نے سب سے پہلے میرے لئے کھانا پروسا۔ پھر پرتاپ کے لئے۔ پھر دلیپ کے لئے۔ پھر ہرنام کور کے لئے۔ سب سے چھوٹے ہربنس نے مچل کر کہا ــــ

"میں تو ماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا!"

بیماں نے پرینو سے کہا ــــ

"تو بھی بیٹھ جا اب!"

"میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟" پرتیو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولہے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما اٹھے تھے اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔" دلیپ نے اپنی تھالی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرتیو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر اسے دلیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔

میں نے کہا: "ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزا دونا ہو جائے۔"

"اچار تو اندر کوٹھری میں ہے!" پرتیو نے رک رک کر کہا۔

"تو کیا ہوا۔ اندر سے جا کے لا دے!"

پرتیو سہم کر بولی: "اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے؟" — یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا — "اس وقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن اس

رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا ---؟" یکایک میں نے تنک کر کہا۔ جانے کیسے کہہ دیا۔ اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا، کیسے وہ بات یوں ایک طعنہ بن کر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی

پرینو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا، جیسے وہ کرپان لئے میرے سر پر کھڑی ہو۔ پھر ایک بجلی سی تڑپی۔ اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اوپر ہاتھ اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار، کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔

"پرینو، پرینو! رک جا۔"

مگر پرینو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصے میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر، اور اپنے جسم اور روح کی پوری طاقت سے پرینو کی گردن پر بھرپور وار کر دیا۔ پرینو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری

اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہوگئی۔ اور اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے !!"

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھوت کی طرح کھڑا تھا

گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور ستے ہوئے تھے۔۔

جیسے وہ چہرے نہ ہوں، بہروپیوں کے خول ہوں۔

گاڑی کھیتوں میں سے گذرتی ہوئی، کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اور چاند — مجبور اور بےکس، تنہا اور اکیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کے بعد بوڑھے سکھ نے دل گیر سے لہجے میں کہا ——

"عورت کبھی نہیں بولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر بٹھا کے، رب تیجے بیاہ کرا کے، اس کے دل کا سپنا اس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے! —— عورت کبھی نہیں بھولتی !!"

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے رخسار کی سلوٹ پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا، اور خاموش ہو گیا۔

پرتو

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی ــــ
میں نے منہ کھول کر دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لئے۔ پھر اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی ــ
لڑکی کا ہاتھ ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ اور لڑکے کا باز ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا۔ اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں، او دونوں سو رہے تھے۔
یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے ا ہاتھ لڑکے کے نیچے سے نکالا، اور لڑکے کی طرف دیکھا۔ اور جب ا اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے۔ تو اس نے نوجوان کا با اپنے شانے سے الگ کیا۔ اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا ــــ پھر ایسی حسرت آمیز التجا سے دیکھا جو اس کی گلنار مسکرا

کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔

میں بالکل بھونچکا رہ گیا۔

یکایک میری نظر میں ایک کرپان سی لہلہاتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں!

دوسرے لمحے میں جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرا لیا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اگرچہ میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے!

دُکھ کا دُکھ پائی کا پائی

چونکہ بہار میں کوئی قحط نہیں ہے۔ اور کہیں پر بھکمری نہیں ہے۔ اسی لئے تو شیامو بہاری ساکن موضع پتیا ضلع مظفر پور، اپنے گاؤں سے بھاگ کر زندہ اور صحیح سلامت بمبئی پہونچ گیا تھا۔ اگر بھکمری ہوتی تو وہ کیوں نہ اپنے ہی گاؤں میں بھوک سے مرجاتا۔ بمبئی کیسے پہونچتا؟ —— اور صرف روٹی کپڑے پر نوکری کیسے تلاش کرتا؟۔

میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتوں کے متعلق بھانپ جایا کرتا ہوں۔ شیامو کی آمد سے میں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ بہار میں کہیں پر بھکمری نہیں ہے۔ گورنمنٹ بالکل سچ کہتی ہے اور یہ اخبار والے بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

جب شیامو بہاری کو میں گھر لے کے آیا، تو لکشمی بے حد خفا ہوئی ساڑھی کے پلو میں لٹکا ہوا چابیوں کا چھلا گھماتے ہوئے بولی "آخر تم کیا چاہتے ہو؟ میں کوئی کام نہ کروں، بیٹھے بیٹھے کر موٹی ہوتی جاؤں۔ — اور تم بڑے آرام سے چند سالوں کے بعد کوئی دوسری نازک بانکی لے آؤ؟ نہیں جی، میں کچھ نہ سنوں گی، میں اس نوکر کو نکال دوں گی!"

میں نے کہا "سنو لکشمی، تمہیں — ذرا سوچو تو پیاری لکشمی تمہیں اس گھر میں کتنا کام کرنا پڑتا ہے؟"

"کیا کام کرنا پڑتا ہے؟" لکشمی بھڑک کر بولی "اس گھر میں آدمی ہی کتنے ہیں۔ ایک تم ہو۔ حالانکہ — مجھے اس میں شبہ ہے۔ ایک میں ہوں۔ ایک میرا چھوٹا بھائی ہے۔ دو تمہارے بڑے بھائی ہیں ایک تمہارا باپ ہے۔ ایک میری بے چاری بڈھی ماں ہے۔ پانچ ہمارے بچے ہیں۔ جن میں سب سے چھوٹا ہمارا کشو چار سال کا ہے۔ گھر کے آدمی ہی کتنے ہیں؟ کیا تم نے مجھے اپاہج سمجھ رکھا ہے؟"

"سنو ڈارلنگ، آج کل کے نوکر تو بس گھر کی شوبھا ہوتے ہیں سارا کام تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ گذشتہ بارہ سالوں کی طرح!"

"تب ٹھیک ہے۔ مگر اسے تنخواہ کیا دینا پڑے گی؟"

"کچھ نہیں، بس روٹی کپڑا!"

"باسی روٹی اور کپڑا —؟" لکشمی زور سے چلائی — اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں - پھر وہ کچھ لمحے بیسویں صدی کے اس نئے معجزے یعنی شیامو بہاری کو حیرت سے تکتی رہی، جو صرف روٹی کپڑے پر کام کرنے کے لئے آمادہ تھا - پھر میری طرف مڑکر شکایت آمیز لہجے میں بولی -

"تم تو کہتے تھے بہار میں قحط — !"

"بالکل نہیں" — میں نے کہا — "بلکہ اس محض روٹی کپڑے پر قناعت کرنے والے نوکر دیکھ کر بمبئی میں بھی قحط نہ آنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے !"

"تب تو ٹھیک ہے" لکشمی نے سر ہلا کر کہا -

"چل بے شیامو، اس کمرے میں جھاڑو دے"

جھاڑو دینے کا حکم بجا لاتے ہوئے جب شیامو نے جواب میں غسل خانے کا لوٹا پیش کیا، تو لکشمی چند لمحوں کے لئے کچھ حیران سی رہ گئی -

بعد میں جب کدو کش مانگنے پر لکشمی کو چمٹا ملا، اور مجھے تولیہ مانگنے پر جوتا پیش کیا گیا — تو میں سمجھ گیا کہ بہار میں نہ صرف یہ کہ

قحط نہیں ہے، بلکہ وہاں پر ایک زبان ایسی بھی بولی جاتی ہے، جس کا نام میتھلی ہے۔ اور جو ہماری زبان سے بہت مختلف ہے۔ اس سے پہلے میں میتھلی کو بھاشا کا درجہ دینے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہ تھا، کیوں کہ ہندوستانی ودھان یعنی دستور میں میتھلی بھاشا کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

بہرحال آدمی اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے لکشمی سے اس کا ذکر کیا۔ کہا — "چلو اچھا ہی ہوا، اب تمہیں میتھلی بھاشا بھی سیکھنا پڑے گی۔ بہت عرصے سے تم نے لکھنا پڑھنا چھوڑ رکھا تھا۔"

چھ ماہ کے عرصے میں ہی شیاموگھر کے کاموں میں طاق ہو گیا، کچھ ہم نے اس کی بھاشا سیکھ لی۔ کچھ اس نے ہماری غفلت سے فائدہ اٹھانا سیکھ لیا۔

ایک سال کے عرصے ہی میں اُس نے ہر اتوار کو چھٹی لے کر سینما جانا شروع کر دیا۔ اور دو روپے نقد تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگا جو دوسرے سال پانچ روپے پر پہونچ گئی۔

اب وہ اپنی ملازمت کے تیسرے سال میں تھا۔ اب اُس نے اپنی چُٹیا منڈا ڈالی تھی۔ انگریزی بال رکھ لئے تھے۔ اور دوسرے فیشن ایبل نوکروں کی طرح نیکر اور بُش شرٹ میں گھُومتا تھا۔ اور میتھلی کے بجائے بمبیّا کی بازاری زبان میں گفتگو کرنے لگا تھا۔

جب لوگ اپنے ملک کی زبان اور تہذیب کو بھول جاتے ہیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ روٹی کپڑا مانگتے مانگتے جب لوگ اپنی ملازمت کے تیسرے سال ہی میں دس روپے تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً اٹھ کر مل اونرز ایسوسی ایشن کا ممبر بن جاؤں

ہم ہندوستانیوں میں اگر کوئی کمی ہے تو صرف کردار کی۔ اور جب تک فرد کا کردار اونچا نہیں ہوگا، یہ قوم کیسے اونچی ہو سکتی ہے! — مگر میں نے شامو کو دس روپے دینا بھی منظور کر لیا۔ ایک تو اس لئے بھی کہ محلے میں دوسرے نوکروں کی تنخواہیں اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ نہ جانے کیوں میرے دل میں غریبوں کے لئے بڑا درد ہے۔

اس کے علاوہ، شامو گھر کے لوگوں کا مزاج خوب سمجھ چکا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ گھر کے سب لوگ نوکر کا مزاج خوب سمجھ چکے ہیں، نیا نوکر آئے گا، تو اس کا مزاج سمجھنے میں بڑی دقت ہوگی۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ شیاموہیں ہزار نقائص پیدا ہو گئے ہوں مگر وہ گھر کا کام بڑی دلچسپی سے کرتا ہے۔ اور ہر وقت کام میں جُٹا رہتا ہے۔ کبھی بیمار نہیں پڑتا۔ اور بمبئی کا پانی تو ایسا خراب ہے کہ یہاں آکر ہٹے کٹے نوکر بھی ہفتے میں دو بار بیمار پڑ جاتے ہیں اور مجھے صحت مند، چاق و چوبند لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔

فرد کی صحت، پر قوم کی صحت کا دار و مدار ہے

علیٰ ہذا القیاس!

شیاموکی مُلازمت کے تیسرے سال ایک عجیب واقعہ ہوا— اُن دنوں لکشمی کو چوتھا ماہ لگ رہا تھا۔ اور وہ ہونے والے بچے کے لئے کپڑے اور دیگر سامان تیار کر رہی تھی۔ اس نے بڑی محنت سے خوب صُورت سے ننھے ننھے چھ فراک سئے، کہ اس میں سے دو فراک غائب ہو گئے۔

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اُن دو ننھے ننھے فراکوں کو چُرانے والا کون ہو سکتا ہے؟

گھر بھر میں ڈھونڈ لیا، لیکن فراک نہ ملے۔

پل بھر کے لئے شیاموپرشبہ کیا گیا، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ہنس کر اس خیال کو دل سے دور کر دیا گیا اب اگر گھر کے کسی بڑے آدمی کا کپڑا ہوتا تو فوراً سب سے پہلے دھیان اسی طرف جاتا۔

اس کے بعد، منّے کے لئے ایک پیاری سی رُلائی جسے لکشمی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا تھا، اچانک گھر سے غائب ہو گئی ——!

محلے کی بوڑھیوں نے مشورہ دیا کہ کسی جھاڑ پھونک والے کو بلانا چاہئے۔ ہو نہ ہو، گھر پر کسی آسیب کا سایہ پڑ رہا ہے۔ جو آنے والے بچے کے لئے خطرناک ہے۔

لکشمی نے ڈر کر مجھ سے التجا کی۔

میں دراصل اس قسم کے ڈھکوسلوں میں یقین نہیں رکھتا۔ مگر میں کسی دوسرے کے مذہبی عقائد میں بھی دخل اندازی نہیں کرتا —— پھر ہندوستان میں تو ایک لادینی ریاست قائم ہو چکی ہے۔ اس لئے میرے لئے یعنی ایک پرامن شہری کے لئے یہ اور بھی لازم تھا کہ میں لکشمی کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے پنڈت گردھر پرساد کو گھر پر دعوت دوں، اور پنڈت گردھر پرشاد سات دن ہمارے گھر آ کر جاپ کرتے رہے جس

سے گھر کی ساری فضا ایک دَم بدل گئی۔ ماحول روشن روشن سا معلوم ہونے لگا۔ لکشمی کی دلی بشاشت عود کر آئی
اور اس کے بعد سے گھر میں اس قسم کی چوریوں کا سلسلہ بھی یک لخت منقطع ہو گیا۔ جس سے اس خیال کو مزید تقویت پہونچی، کہ ہو نہ ہو گھر میں کوئی سایہ تھا۔ جو پنڈت جی کے جاپ سے ڈر کر کہیں چلا گیا ہے۔

اس دن سے میں نے گھر والوں کے مذہبی عقائد میں دخل دینا اور بھی کم کر دیا ہے۔ بلکہ لکشمی کے پیہم اصرار پر دفتر میں اپنی ترقی کے لئے بھی پنڈت جی سے جاپ کرانا شروع کرا دیا ہے۔ حالانکہ اپنے خیال پر اسی سختی سے کاربند ہوں۔ لیکن اگر میرے ایک ذرا سے جاپ کرانے سے گھر کی لکشمی خوش رہتی ہے، تو میرا کیا ہرج ہوتا ہے —؟

تین ماہ کے بعد لکشمی نے یکا یک شکایت کی: "دُودھ میں پانی ملا ہوتا ہے۔ دو دن سے دیکھ رہی ہوں — دودھ کا ذائقہ ہی بدل گیا ہے —!"

میں نے کہا: "دودھ کا نہیں، تمہاری زبان کا ذائقہ بدل گیا ہے اس حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

لکشمی بولی، "یہ دودھ پی کر مجھے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں!"

"اُبکائیاں بھی آتی ہیں؟" میں نے تسلّی دے کر کہا۔ "کیا اتنی جلد بھول گئیں؟"

"میں اندھی نہیں ہوں؟" لکشمی نے جل کر کہا: "جو اچھے اور بُرے دودھ میں تمیز نہ کرسکوں۔ ضرور کوئی نہ کوئی اس دودھ میں ملاوٹ کر رہا ہے۔"

"سرکاری ڈیری سے سربہ مہر بوتل میں بند دودھ آتا ہے۔ یہ دودھ خالص کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دودھ ایک دم بُرا ہے۔" لکشمی نے جھلّا کے کہا۔ "تم خود چکھ کے دیکھو!"

شادی کے بعد میں تو دودھ کا ذائقہ ہی بھول گیا۔ بچوں ہی کے لئے پورا نہیں ہوتا مجھے کیا معلوم ہوگا۔

لیکن جب لکشمی کی بے چاری بڑھی ماں نے جو ہر دم گاؤ تکیے سے لگی لگی حکم چلایا کرتی تھیں، اور نوّے سال کی عمر پر بھی مرنے کا نام نہ لیتی تھیں، دودھ کے متعلق شکایت کی تو مجھے غور کرنا پڑا۔ مگر غور کروں تو کیا کروں!

گذشتہ تین سال میں شیامو نے ایک بار بھی دودھ کی چوری

نہ کی تھی۔ ایک پائی کی چیز ادھر سے اُدھر نہ کی تھی۔ پھر اسٹیشن کے پاس جو سرکاری ڈیری کی شاخ ہے وہاں سے سر بہ مہر بوتل آئی تھی۔ ہر روز صبح سات بجے شیامو ڈیری کی شاخ پر جاکے کیو (Q) لگاتا تھا، اور اپنی باری پر بوتل لے کر گھر آتا تھا۔ گھر پر آ کر سب کے سامنے کھانے کی میز پر دودھ کی بوتل رکھ دیتا تھا۔ ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ مُہر سلامت ہے ــــ اب ڈیری والے دودھ میں پانی ڈالتے ہوں، تو دوسری بات ہے!

اگر ایسا ہو تو محلے والے ــــ دوسرے گھروں کے لوگ جہاں پر بھی اس سرکاری ڈیری سے دودھ آتا ہے، کیوں شکایت نہیں کرتے؟ اکیلی لکشمی ہی کو یہ شکایت کیوں ہے؟ ہو نہ ہو لکشمی کی زبان کا ذائقہ بدل چکا ہے ــــ اور وہ بڈھی ماں تو سٹھیا گئی ہیں، یا اپنی بچی کی 'ہاں میں ہاں' ملا رہی ہیں۔ اس لئے میں نے اچھی طرح سے سوچ سمجھ کے لکشمی کو ڈانٹ دیا۔

لیکن جب میرے ڈانٹنے پر بھی لکشمی کی شکایت رفع نہ ہوئی تو میں نے شیامو سے کہہ دیا ــــ

"آج سے دودھ کی بوتل میں خود لایا کروں گا۔ تم گھر کا دوسرا کام کرو!"

سشیامو کو برا تو بہت معلوم ہوا۔ مگر فرماں بردار نوکر تھا،
"اچھا جناب!" کہہ کے، سر جھکا کے کچن میں چلا گیا۔

دوسرے دن جب سات بجانے بجاتے گھڑی نے آٹھ بجا دیئے
تو میں بہ ہزار دقت پلنگ سے اٹھ کر شادی کرنے کی حماقت پر لعنتیں
بھیجتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

کچن میں سشیامو منہ لپوپے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے ایک
خالی جھولا طلب کیا۔ اس میں دودھ کی خالی بوتل کو ڈالا۔ دودھ کا
راشن کارڈ جیب میں رکھا ـــ اور اسٹیشن پر دودھ لینے کے لئے
روانہ ہوا۔

دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے جب ڈیری کی شاخ پر پہونچا، جہاں
سے دودھ ملتا ہے تو وہاں نوکروں کا پہلے سے ایک املیا "کیو" موجود
تھا ـــ

میرے آگے ایک سانولی سںتھری، دبلی پتلی، نوکرانی تھی جس کے
چہرے پر چھائیاں تھیں، اور جو بڑی مشکل سے سانس لیتی تھی۔ اور

جس کے پیٹ میں غالبًا نو ماہ کا بچہ ہوگا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بچہ جن دے گی۔ اُس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ اور جب اُس نے مجھے اپنے پیچھے آکر کھڑے دیکھا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے بجھ سی گئیں۔ اور وہ بے حد پژمردہ اور اداس سی نظر آنے لگی۔ لیکن میں نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ صنفِ نازک پر مجھے دیکھ کر اس طرح کا ردّعمل ہوتا ہے۔

میں نے اپنی پتلی سی گردن کو ذرا اُونچا کیا، اور نگاہیں اٹھا کے دیکھنے لگا کہ ابھی "کیُو" کتنا باقی ہے۔

یکایک اُس لڑکی نے کہا۔ "آج ششیامو نہیں آیا؟"

میں نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔ "نہیں!"

"نہیں" میں کچھ اس طرح کے جملے بھی شامل تھے: تم کون ہوتی ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والی؟ میں نوکر پیشہ لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں یہاں ہر روز دودھ لینے نہیں آتا۔ میں اس قسم کے ذلیل کام خود نہیں کیا کرتا۔ تمہاری یہ مجال کہ آج تم ایک نوکرانی ہوکر مجھ سے یوں بے تکلفی سے سوال کر رہی ہو۔ صرف اس لئے ــــ کہ میں تمہارے پیچھے کیُو میں کھڑا ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے؟ میں اس کا علاج ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں آج سرکاری ڈیری کے مینجر کو خط لکھتا

ہوں کہ وہ ڈیری کی ہر شاخ پر دو کیو لگوائے۔ ایک نوکروں کے لئے، دوسرا نوکروں کے مالکوں کے لئے۔ ورنہ لا اینڈ آرڈر کے لئے سخت خطرہ ہے! ہونہہ!

اُس لڑکی نے بڑے ملتجیانہ انداز میں مجھ سے پوچھا "کیا وہ بیمار ہے؟"

"نہیں، بالکل ٹھیک ہے۔ مگر آج سے وہ یہاں دودھ لینے نہیں آئے گا!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ چپ ہو گئی۔

وہ بار بار کبھی اپنا ایک پاؤں اُٹھاتی کبھی دوسرا۔ آرام لینے کی کوشش کرتی۔ مگر کیو آخر کیو ہے۔ یہاں ہر شخص کی اپنی باری پر باری آتی ہے۔ آخر اس کی بھی باری آ گئی۔ اور اس نے اپنے مالک کے گھر کے لئے ایک چھوٹی بوتل میں دودھ لے لیا۔ پھر میری باری آ گئی۔ اور مجھے بڑی بوتل مل گئی۔

بوتل لے کر جب میں پلٹا تو وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی اور ایسی گرسنہ نگاہوں سے دودھ کی بوتل کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ایک ہی گھونٹ میں اسے پی جائے گی۔

اُس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن اس کا آگے بڑھا ہوا ـــــ

رست طلب کی طرح بیٹ گویا مجھ سے کہہ رہا تھا "میں خود تو کچھ نہیں چاہتی، اور مجھے کچھ چاہئے بھی نہیں۔ لیکن میرے اندر جو معصوم جان ہے۔ یہ جو ظالم لوتھڑا ہے۔۔ جو میرا دن رات خون چوستا ہے۔ اس کی طلب کو میں کیا کروں۔ میں ایک غریب نوکرانی ہوں۔ جسے خود پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ میں پھر اس آنے والی جان کے تقاضے کیسے پورے کروں۔ یہ دودھ مجھے دے دو ___ یہ دودھ مجھے دے دو .... بھگوان کے لئے ___ اب صرف چند دنوں کی بات ہے۔ پھر بھگوان میرے سینے میں دودھ اُتار دے گا ___ پھر میں کبھی تم سے اس دودھ کی بھیک نہ مانگوں گی!"

میں نے دودھ کی خالی بوتل جھولے میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تم شبامو کو جانتی ہو؟"

"وہ میرا گھر والا ہے!" اس لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ اور اس کی بڑی بڑی پلکیں حیا سے رخساروں پر جھک گئیں۔

میں ایک بارگی چونکا۔

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر وہاں سے پلیٹ کر اپنے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

گھر پہونچتے ہی لکشمی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ پوچھنے لگی: "کیا معلوم ہوا؟"

"یہی معلوم ہوا کہ یہاں ہیں تمہارا بھی میٹھی ایک خوب صورت زبان ہے اور ہر نوکر ایک دل رکھتا ہے!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کوئی امیر گھر سے ایک ننھی سی دلائی اس لئے چُراتا ہے کہ کسی کی بے آسرا جان کو تھوڑی سی حرارت مل جائے۔ کوئی بھینس کے دودھ میں پانی ملا کے اس لئے پلاتا ہے کہ کسی کی زندگی کو تھوڑا سا آب حیات مل جائے۔ لکشمی اس دنیا میں بچوں کی دلائیاں اور دودھ کی بوتلیں اس قدر کم کیوں ہیں؟"

لکشمی کچھ نہ سمجھی۔ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ باہر شیامو اپنا بستر باندھ رہا تھا۔ اور نوکری چھوڑ کر جانے کے لئے بے تاب تھا۔

میں نے کہا

"شیامو! کل سے دودھ تم ہی لایا کرو گے میں نے تحقیقات کرلی ہے۔ تمہارا لایا ہوا دودھ بے حد میٹھا اور عمدہ ہے۔ صرف دنیا کا ذائقہ بدل چکا ہے — !"

بیمار باپ

اب یہ بات دوستوں پر کھل چکی تھی کہ مہتہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کا باپ جلد سے جلد مَر جائے!

چندر کانت مہتہ ہمارا دوست تھا اور ہمارا ہمسایہ بھی تھا۔ وہ دُبلا پتلا اُونچے لانبے قد کا ادھیڑ عمر کا ایک دلّال تھا جو کرایہ کے مکانوں یا اونرشپ فلیٹوں کی دلّالی کرتا تھا اور پالی پارک میں رہتا تھا۔

پالی پارک کے نئے بنگلوں میں جتنے کرائے دار آتے تھے، اُسی کی معرفت آتے تھے، اور جو نئے بنگلے بن رہے تھے ان کے کرایہ دار بھی اسی کی معرفت آئیں گے۔ اس کا بھی ہمیں علم تھا۔ کیوں کہ چندر کانت مہتہ، سیٹھ خوب چند کو خوب اچھی طرح سے جانتا تھا، اور سیٹھ خوب چند

ان تمام بنگلوں کا مالک تھا۔ اسی لیے چندر کانت مہتہ نے دن رات خوشامد کرکے اور مسکہ لگا لگا کے سیٹھ خوب چند کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ حالانکہ سیٹھ خوب چند بے حد بد زبان اور تیز مزاج سیٹھ تھا۔۔۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کھردری سے کھردری طبیعت میں خوشامد کا مکھن لگانے سے چکناہٹ پیدا ہوجاتی ہے! اور اگر نہیں جانتے ہیں، تو ایک دن جان جائیں گے!

بہرحال چندر کانت مہتہ کو زمانے کی تلخیوں نے یہ گُر اچھی طرح سکھا دیا تھا۔ لیکن اس دنیا میں صرف خوشامد کافی نہیں ہے۔ نئے مکانوں کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ اگر نئے مکان نہ بنیں گے تو نئے کرایہ دار ان میں کیسے آکر بسیں گے؟ اِن دنوں مکانوں کی قِلّت کا یہ حال ہے کہ ایک بار جو کرایہ دار مکان میں آکے بس گیا، بس وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔

پچھلے زمانے میں سُنا ہے کہ کرایہ دار انتہائی شریف اور مہذب ہوا کرتے تھے، مالک مکان کے ایک ہی نوٹس پر گھر خالی کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ آج کل کے کرایہ دار دس بار مقدمہ کرنے پر بھی نہیں نکلتے۔۔ کوئی انسانیت ہے؟

آخر چندر کانت مہتہ کہاں جائے؟ اسے ہر ماہ اپنے گھر کے خرچ

کے لئے ایک ہزار روپیہ چاہیئے۔ اور سکانوں کی دلالی سے اور دوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے اُسے مشکل سے چار پانچ سو روپئے کی آمدنی ہوتی ہے۔ باقی رقم وہ ہر ماہ کہاں سے لائے؟ اس لئے وہ بے چارا ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ کیوں کہ چندر کانت مہتہ کے پاس ایک خوب صورت گڑیا سی بیوی ہے اور ایک خوب صورت ننھی سی کار ہے۔ اس لئے جب وہ بڑے پیار سے "بے بی" کہہ کر آواز دیتا ہے تو اکثر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنی بیوی کو بلا رہا ہے یا اپنی کار کو!

جب ایک گھر میں دو خوب صورت چیزیں جمع ہو جائیں، تو اسی طرح کی گڑبڑ ہوتی ہے۔ خصوصاً جب صاحب کو ایک ہی نام سے دونوں کو پکارنے کی عادت ہو۔ اس وقت ہم لوگ جو اس کے ہمسائے ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ محض اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کرتے ہیں، کہ روئے سخن کدھر ہے۔

"آج میں نے بے بی کے لئے ایک عمدہ ساڑی خریدی ہے۔"

ظاہر ہے اس وقت، بے بی سے مطلب ہے اس کی بیوی ورنہ گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے؟ ساڑی کو گاڑی میں تو سبھی بٹھاتے ہیں، لیکن گاڑی کو ساڑی کون پہناتا ہے؟ یا وہ جب ہم سے یوں ہم کلام ہوتا ہے۔

"اجی کل ہی کی بات ہے کہ میں اپنی بے بی کو دھور رہا تھا کہ اتنے میں..... "

ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس وقت بے بی سے مراد گاڑی ہے بیوی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔

"میری بے بی کے چوٹ آگئی ہے"۔

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز مہتہ کے پاؤں میں موچ آگئی ہے یا کار کو ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، یا ——

"آج بے بی نے مجھے راستے میں بہت پریشان کیا"۔

اب راستے میں بیوی بھی پریشان کر سکتی ہے اور گاڑی بھی! اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ کیا بات ہوئی۔ بیوی کے مزاج کا پارہ تیز تھا یا گاڑی کی بیٹری ڈاؤن تھی؟ ایسے موقعوں پر بھی انتہائی سنجیدگی سے سر ہلا کر صرف ہوں ہاں کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے!

بے بی کے علاوہ چندر کانت مہتہ کا پسندیدہ موضوع اس کے باپ کی علالت ہے۔ اس کا باپ چمن مہتہ پچاس برس کا بوڑھا ہے۔ بیٹے کی طرح دبلا پتلا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سوکھا ہوا —— اپنے بیٹے ہی کی طرح چمن مہتہ لانبا ہے۔ لیکن اس کی آواز اس شدید علالت کے باوجود بارعب دار اور کراری ہے۔ بیٹے کی آواز میٹھی اور لچک دار ہے۔

چندر کانت کی آواز سنتے ہی خیال ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو یا تو دلال ہونا چاہیئے، یا شہد کی مکھیاں پالنے کا بیوپار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے باپ چمن مہتہ کی کراری آواز سے اس کے دولت مند ہونے اور اس کے کنجوس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

باپ بیٹے دونوں ایک بنگلے میں پالی پارک میں رہتے ہیں — چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ دونوں دن رات بڈھے کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

بڈھے کا سارا جسم سوکھ گیا ہے۔ پیروں پر ورم آ گیا ہے۔ آنکھوں سے بہت کم دکھائی دینے لگا ہے لیکن پھر بھی سانس کی آمد و رفت جاری ہے، اور گردن اتنی سوکھ گئی ہے کہ سانس نرخرے سے آتی جاتی معلوم ہوتی ہے۔ بڈھا اس پر بھی زندہ ہے اور جیئے جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ کئے جاتا ہے۔

اس کے دو بیٹے اور بھی ہیں۔ لیکن اب وہ اپنے بڈھے باپ کی خدمت نہیں کرتے۔ کیوں کہ بڈھا تو دس سال سے بیمار ہے — اور وہ دونوں بیٹے پہلے ہی چار سالوں میں اس کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ ہر جذبے کی ایک میعاد ہوتی ہے، ایک عمر ہوتی ہے، جہاں پہونچ کر وہ دم توڑ دیتا ہے۔ ان دونوں بیٹوں کے ساتھ یہی ہوا۔ آخر میں بڈھے

نے چندر کانت مہتہ کی خدمت سے خوش ہو کر اپنے دونوں بیٹوں کو جائداد سے بے دخل کر دیا۔ کیوں کہ یہ جائداد پشتینی نہ تھی، بڈھے کی اپنی پیدا کردہ تھی ــــ

دوسرے دونوں بیٹوں کو اس کا بہت غم تھا۔ اور وہ دونوں غم و غصہ میں اکثر اپنے بھائی چندر کانت مہتہ کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے، اور اکثر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ ہمارے بھائی نے جائداد کے لالچ میں آ کر ہمارا گلا کاٹا ہے۔

چندر کانت نہایت خاموشی سے اُن کی باتیں، اُن کے طعنے سُنتا، اور پھر اپنے بڈھے باپ کی خدمت کئے جاتا۔

آج چھ سال سے وہ اپنے بڈھے باپ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ کوئی فرماں بردار سے فرماں بردار بیٹا بھی اپنے باپ کی ایسی خدمت نہیں کر سکتا۔ جتنی خدمت چندر کانت کرتا تھا، اور وہ بڑے فخر سے اپنے اس کارنامے کو دوستوں میں بیان کرتا تھا۔

چندر کانت خاصا مذہبی آدمی بھی تھا، اور اسے لیکچر سننے اور سنانے کا بھی شوق تھا۔ اکثر دھارمک مجلسوں میں وہ رامائن سے مثالیں دیتے ہوئے اپنے بڈھے باپ کی علالت کا ضرور ذکر کرتا تھا لوگ اُس کی اس بے ضرر سی کمزوری کو معاف کر دیتے تھے۔ آخر جو بیٹا اتنے سال باپ کی

خدمت کرے گا، کیا اُسے اپنی خدمت کے صلے میں خود ستائی کے دو لفظ کہنے کا بھی حق نہ ہوگا؟"

چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ بڈھے باپ کے خریدے ہوئے بنگلے میں رہتے تھے۔ کسی زمانے میں بڈھے باپ کو پرانے ٹائپ کا فرنیچر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے اس کا بنگلہ اس قسم کے فرنیچر سے پٹا پڑا تھا۔ مسز مہتہ اور اپنے بیٹے کو بڈھے نے دو کمرے دے رکھے تھے۔ باقی سب کمروں میں اس کا سامان پڑا تھا، اور کوئی چیز اُس کی اجازت کے بغیر اِدھر اُدھر نہ ہو سکتی تھی۔

مسز مہتہ اس بات سے بہت کُڑھتی تھیں، اور کبھی کبھار اپنی سہیلیوں سے گفتگو کرتے وقت اُن کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے۔

"دیکھنا، ایک دن میں اس بنگلے کو کیا سجاؤں گی؟"

اس سجانے کے پس منظر میں چھپے ہوئے اس کے دل کے ارمان کھل کر سامنے آجاتے تھے۔ لیکن یوں کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ ورنہ مسز مہتہ ایسے معاملات میں بہت محتاط رہتی تھی۔ اور بڈھے کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس کا بیٹا اور اس کی بہو دوسرے ناخلف بیٹوں کی طرح نہیں سچے دل اور سچی لگن سے بڈھے باپ کی خدمت کرتے ہیں۔

گو بڈھے نے اپنے پہلے دونوں بیٹوں کو بے دخل کر دیا تھا، پھر بھی گھر پر اس کا پورا پورا کنٹرول تھا۔ تمام ضروری کاغذات، ہنڈیاں، تمسکات، زیور اور نقد روپیہ وہ ایک تجوری میں بند کر کے رکھتا تھا، تجوری بڈھے کے کمرے میں رہتی تھی، اور چابیاں بڈھے کے تکیے کے نیچے۔ اور بڈھا اس قدر شکی مزاج تھا کہ اگر اس کا اپنا بیٹا بھی کبھی بند تجوریوں کی طرف دیکھ لیتا تو بڈھے کی آنکھوں میں شک و شبہ کا طوفان اُٹھنے لگتا، اور اس کے سانس کی آمد و رفت تیز ہو جاتی۔

اپنی علالت کے دوران بڈھا آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا۔ پہلے تو وہ بستر سے اٹھ سکتا تھا، اور دروازہ بند کر کے اپنے بیٹے اور بہو کو باہر نکال کے تجوری کھولتا تھا، اور تجوری کے اندر دولت کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب بستر سے اٹھنا بھی اس کے لئے ممکن نہ رہا۔

اس دن کے بعد سے تجوری کبھی نہ کھُلی!

بڈھے نے یُوں تو کبھی کچھ نہ کہا۔ لیکن بڈھے کی آنکھوں کی حریص چمک کہے دیتی تھی کہ تجوری کی طرف کوئی جائے بھی نہیں۔ بہو نے غالباً اس کا خیال بھانپ لیا تھا اسی لئے اس نے اور بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار شاید چور نگاہوں سے وہ اس تجوری کو

دیکھ لیتے ہوں گے۔ جس کے اندر اُن کا مستقبل بند تھا۔ لیکن صاف کھلے انداز سے اسے دیکھنے کی جرأت انہیں کبھی نہیں ہوئی۔

چندر کانت مہتہ تو بڈھے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا تھا، اور بڈھے کے پاس بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگتا اور بڈھا ہولے ہولے کھانسنے لگتا۔

لیکن بڈھا کچھ بھی کرتا، اس کی بے بس اور مجبور نگاہیں تجوری ہی کی طرف چلی جاتیں، اور پھر وہیں جم جاتیں' پہروں، گھنٹوں وہ اپنی تجوری کو دیکھا کرتا جس میں اس کی زندگی کا اثاثہ بند تھا۔۔۔

گو اب وہ اس میں ہاتھ تو نہ لگا سکتا تھا، اور نہ اُسے کھول کر دیکھ سکتا تھا، لیکن اسے اس بات کا بھروسہ تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے نہ تجوری کھلے گی، نہ اُس کی زندگی میں اُس کی کمائی پر کوئی ہاتھ صاف کر سکے گا!

دھیرے دھیرے بڈھا کمزور ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے تجوری پر گرد و غبار کی تہیں چڑھتی گئیں، اور وہ منحوس' بدصورت، زنگ آلود تجوری، ایک سنگین قبر کی طرح تاریک نظر آنے لگی۔ مکڑی نے اس پر ایک بڑا جالا بنا لیا تھا۔ اور۔۔ خود بڈھا اپنے میلے بستر پر پڑا ہوا خفیف آواز میں کھانستا

رہتا تھا۔

لیکن چندرکانت مہنہ اپنے بڈھے باپ کی خصلت سے واقف تھا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی، ایک بار بھی اپنے بڈھے باپ سے روپے نہیں مانگے۔ خود دن رات محنت کی، قرضہ لیا، اِدھر اُدھر سے مانگ مانگ کے اپنے دن کاٹے۔ لیکن تجوری کو کھولنے کی استدعا کبھی نہ کی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ استدعا اس کا وقار اس کے باپ کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔

اس کے دونوں بھائی جائداد سے بے دخل ہو چکے تھے۔ اب تو یہ ساری کی ساری دولت صرف اسی کے حصے میں آنے والی تھی۔ صرف بڈھے کے مرنے کا انتظار تھا۔ لیکن چندرکانت نے کبھی بڈھے پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کس شدت سے، کس سچائی سے، کس لگن سے وہ بڈھے کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ بظاہر وہ ہر لحظہ بڈھے کے سامنے اور اپنے دوستوں کے سامنے بڈھے کی صحت کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اسی شدت سے اس کے دل میں بڈھے کی موت کی آرزو اپنے پاؤں ... پھیلائے جاتی ۔۔

کبھی کبھی تو شدتِ انتظار سے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی، اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے، اور وہ نگاہیں جھکا لیتا، کہ

ایسا نہ ہو کہیں دل کے اندر چھپا ہوا جذبہ آنکھوں کے چور دروازے سے جھلک کر باہر نہ آ جائے۔ کبھی کبھی تو وفورِ جذبات سے اس کا دل گھبرانے لگتا۔ ایک مکڑی بستر پر ہے، ایک مکڑی تجوری پر ہے۔ کیوں نہیں وہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے ان تالوں کو توڑ کر اس دولت پر قبضہ کر لیتا جو اخلاقی اعتبار سے اب اس کی ہو چکی ہے!

مگر نہیں۔ ٹھہر، اے دلِ بے تاب ٹھہر! اگر پھل خود ہی پک کر اس کی جھولی میں گرنے والا ہو تو درخت پر چڑھ کر شاخوں سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کیا اس کے دل میں ارمان تھے۔ وہ ان نئے پرانے مکانوں کی دلالی سے عاجز آ چکا تھا۔ وہ ایک بڑا دھندا کرنا چاہتا تھا۔ وہ سٹے کے داؤ پر ایک ہی بار بیس ہزار لگا کر لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مجہول باپ اب تک زندہ تھا، اور زندہ چلا آ رہا تھا۔ ایک ہی سانس تھی جو گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ لیکن کسی طرح یہ سانس باہر نہ نکلتی تھی۔ کبھی کبھی یہ سانس خود اسے اپنے گلے میں پھانسی کی رسّی کی طرح چبھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

بیٹے کی خدمت میں اس کے انہماک میں ایک اس طرح کا جذبہ بلکہ شکوہ شامل تھا، جیسے اس کی روح کا ذرّہ ذرّہ پچاس سالہ باپ کی ضد کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔ کیوں نہیں مر جاتے تم، میرے باپ!

کیوں نہیں تم اس جسم کا مکان خالی کر دیتے ؟ کرایہ دار آتے ہیں کرایہ دار جاتے ہیں، لیکن تم اپنا فلیٹ کیوں نہیں خالی کرتے ؟ پچاس سال ہو گئے تمہیں اس جسم میں رہتے ہوئے۔ اب جاؤ تاکہ میں دلالی کر سکوں اور نیا بزنس کھول سکوں۔

مگر بڈھے کو معلوم تھا کہ جسم ایک ایسا فلیٹ ہے، جو ایک بار خالی کر دینے پر کبھی بسایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے وہ گذرتے ہوئے وقت کی طرف رینگتے ہوئے بھی وقت کے ایک ایک پل سے لڑائی کر رہا تھا، اور اپنی زندگی پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کی گرسنہ نگاہوں میں زندہ رہنے کی ایسی چاہ تھی کہ موت بھی اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ پھر وہ دن آگیا، جب بڈھا بے حد کمزور ہوگیا۔ اس کے کان بہرے ہوگئے۔ اس کی زبان بند ہوگئی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ نبض جواب دے گئی۔

ڈاکٹروں نے کہا : "بڈھا اب چند لمحوں کا مہمان ہے"۔

فرماں بردار بیٹے نے وفورِ غم سے اپنے آنسو پونچھے، اور پہلی بار بند تجوری کی طرف جرأت آزما نگاہوں سے دیکھا۔

اور جس وقت بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھا۔ اسی وقت باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور بیٹے کی وہ نگاہ ایک تیر کی طرح باپ کے

سینے میں گھستی چلی گئی ۔ اور یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے باپ کی طرف محسوس کی جانے والی محبت کا رنگ روغن نوچ لیا ۔ اور اس کے بیٹے کے ننگے جذبات کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا ۔ بڑھے کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری ہوئی ۔ اور اس کی بے بس، مجبور آنکھوں کی حریصانہ چمک غم و غصہ کے شعلے میں تڑپنے لگی ۔

اب جسم خاکی کے کسی کونے میں شاید کہیں جان باقی نہ تھی، صرف ماتھا گرم تھا، اور سانس چل رہی تھی، اور وہ بھی رک رک کر چل رہی تھی — صرف آنکھیں روشن تھیں، اور ان میں ایک غیر معمولی چمک تھی، جو ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی ۔ جیسے لو ختم ہونے سے پہلے ایک بار بلند ہو جائے ۔

بیٹے نے باپ کی نگاہ نہیں دیکھی ۔ ورنہ وہ گھبرا جاتا ۔ اس وقت وہ اپنے دوستوں کے گروہ میں کھڑا اس کمرے میں آہستہ آہستہ کسی سے چندن لانے کے لئے کہہ رہا تھا ۔ کسی سے پنڈت کو بلانے کے لئے تاکید کر رہا تھا ۔ کسی کو گھی کا آرڈر دے رہا تھا ۔ کسی کو نئے کفن کا کسی کو چتا کی لکڑیوں کا —— !

دھیرے دھیرے انتہائی رازدارانہ لہجے میں وہ اپنے دوستوں سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اس کا باپ مردہ ہو ۔ اور آج سے وہ اس گھر کا مالک ہو ۔ اس کے بولنے کے

بیمار باپ

لہجے میں اور اس کے چلنے کے انداز میں غیر شعوری طور پر ایک خاص جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سب دوست آ جا رہے تھے!

عورتیں رونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ بہو کو دلاسا دے رہی تھیں!

لوگ مختلف گروہوں میں بنگلے کے اندر اور باہر کھڑے مختلف باتیں کر رہے تھے، اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے جس میں اب ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق چند لمحوں کی دیر تھی۔

وہ چند لمحے، چند منٹ بھی گذر گئے۔ چند منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بڈھا اسی حالت میں لیٹا تھا۔ اسی طرح اس کی سانس چل رہی تھی ـــــ نبض واپس نہ آئی تھی ـــــ لیکن آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی۔

ایک بار جو بڈھے نے تجوری سے نظر ہٹا کر شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو بیٹا یکایک گھبرا گیا ـــــ یکایک اسے معلوم ہوا کہ

بیمار باپ

جس راز کو اس نے اتنے سال سے اپنے باپ کی نظروں سے بچا کر رکھا تھا وہ آج ایک ہی نگاہ میں افشا ہو گیا ہے !

اب دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر تھیں ـــــ باپ کی بیٹے پر، بیٹے کی باپ پر ـــــ دونوں دشمن آمنے سامنے کھڑے تھے ۔ بیچ میں دولت تھی !

جب صبح کے پانچ بج گئے، تو ڈاکٹر کو بڈھے کی نبض واپس آتی ہوئی معلوم ہوئی ۔

سب لوگوں نے بیٹے کو اور بہو کو مبارکباد دی ۔

ہمسائے رات بھر کے جاگے ہوئے تھے، سب لوگ اپنے اپنے گھر جا کر سو گئے !

صبح نو بجے کے قریب بڈھے کے بنگلے سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوئیں، اور لوگ گھبرا کر نہیں بلکہ اطمینان سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے ۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی کیفیت تھی ۔ آخر وہ گھڑی آ پہونچی جس کا سب کو انتظار تھا !

بیمار باپ

ہم سب لوگ بھاگے بھاگے بنگلے کے دروازے تک پہونچے اور ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیا بڈھا مرگیا ـــــ؟

بنگلے کے پٹھان دربان نے سر ہلاکر کہا۔

"نہیں جناب! بڈھا تو زندہ ہے۔ اس کا بیٹا مرگیا ہے! ابھی ابھی اس کا ہارٹ فیل ہوگیا ـــــ!!"

بلّی اور وزیر

شری اُپادھیائے کا ارادہ قطعی طور پر وزیر بننے کا نہیں تھا۔ وہ گلی شاہ تارا میں ایک معمولی سے وئید تھے۔ گل قند، مدھو کر دھو ج، اور جوارش کونی مروارید والی بیچتے تھے۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ چیف منسٹر کے بھانجے کو جس کا اسی گلی میں رولوں کا ڈپو تھا، ہیضہ ہو گئی۔ اور وہ شری اُپادھیائے کے علاج سے ٹھیک ہو گیا۔ اس نے بر سبیل تذکرہ چیف منسٹر سے شری اُپادھیائے کا ذکر کر دیا۔

چیف منسٹر کو عرصے سے بواسیر کی بیماری تھی، اور کسی طرح ٹھیک نہ ہوتی تھی۔ چیف منسٹر نے اپنے بھانجے کے اصرار پر شری اُپادھیائے کو بلا بھیجا، اور ان کا علاج شروع کر دیا۔

بدقسمتی سے چیف منسٹر جی کی پرانی بواسیر چھ ہی مہینوں میں اُپا دھیائے جی کے علاج سے ٹھیک ہو گئی۔

اب کیا تھا۔ شری اُپادھیائے جی چیف منسٹر کے خاندانی حکیم ہو گئے اُن کا شمار چیف منسٹر کے اپنے آدمیوں میں ہونے لگا۔ شری اُپا دھیائے جی کی حکمت وہ چلی کہ انہیں ایک سال کے عرصے ہی میں اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک گاڑی خریدنی پڑی۔ گھر سے بنگلے میں رہنا پڑا۔ بینک میں اکاؤنٹ کھولنا پڑا۔ غرض کہ چیف منسٹر صاحب کی دوستی ان کے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گئی۔

لیکن یہ سیاسی آدمی آپ تو جانتے ہیں ایک دفعہ جس کے پیچھے پڑ جائیں، زندگی بھر اُسے چین نہیں لینے دیتے۔ ایک دن اُپادھیائے جی کو چیف منسٹر نے بلایا، اور کہا "اُپا دھیائے جی۔ آپ تو ہمارے اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ جنتا منڈل کے سکریٹری کیوں نہیں ہو جاتے؟"

اُپا دھیائے جی نے بہت انکار کیا۔ بولے، "سرکار میں آجکل ماءاللحم اور وراکشا سو کو ملا کر ایک نئی دوا بنانے میں مصروف ہوں، یوں سمجھئے گویا حکمت میں ویدک کا پیوند لگا رہا ہوں۔ دیکھئے اب اس قلم سازی سے کون سی نئی چیز نکلتی ہے؟!"

"کونسی نکلے گی؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں!"

اس پر چیف منسٹر نے اور حیران ہو کر پوچھا: "مگر یہ دوا جو ابھی آپ کو معلوم نہیں کہ کیا ہوگی، کس غرض کے لئے ہوگی؟"

"یہ بھی معلوم نہیں!" شری اُپا دھیائے نے بڑی صاف گوئی سے کہا: "دراصل بات یہ ہے سرکار، کہ انگریزی طریقۂ علاج میں پہلے بیماری ڈھونڈی جاتی ہے۔ بعد میں اس کا علاج دستیاب ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے دوا بنا لیتے ہیں، بعد میں اس کے لئے بیماری ڈھونڈتے ہیں۔"

"تو بالکل ٹھیک ہے!" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "آپ پہلے جنتا منڈل کے سکریٹری ہو جائیے، بعد میں آپ کے لئے کام ڈھونڈ لیا جائے گا۔"

چنانچہ شری اُپا دھیائے جنتا منڈل کے سکریٹری چُنے گئے۔ کیوں کہ وہ چیف منسٹر کے اپنے آدمی تھے۔

پھر جب اسمبلی کا الیکشن سر پر آ گیا تو چیف منسٹر نے اُنہیں پھر بُلا بھیجا، اور کہا ــــ "اُپا دھیائے جی، منڈل کے لوگ آپ کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

اُپا دھیائے جی نے حیران ہو کے کہا: "مگر سرکار میں تو منڈل میں ایک بار بھی نہیں بولا۔"

"یہی تو قابل تعریف بات ہے۔" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "دیکھئے آج کل الیکشن سر پر آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں آپ اسمبلی کے لئے اپنے حلقے سے ممبری کی درخواست دے دیجئے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور........

"مگر جناب!" سری اُپادھیائے نے بالکل پریشان ہو کر کہا۔ "میں ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ آپ کے کامرس ڈپارٹمنٹ کے جائنٹ سکریٹری شری گرما برما ناتھ کا علاج کر رہا ہوں۔"

"انہیں کیا بیماری ہے؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بیماری تو انہیں وہ ہے جو میں ان کی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اب خود ہی سمجھ جائیے۔"

چیف منسٹر کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی۔ راز دارانہ لہجے میں بولے: "تو آپ اُن کا علاج تو ٹھیک سے کر رہے ہیں نا؟"

"علاج تو کر رہا ہوں" اُپادھیائے جی رُک رُک کر بولے "لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا علاج کروں؟ دراصل اس

بیماری کا صحیح علاج سنکھیا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کتنا سنکھیا کھلاؤں، جس سے ان کی بیماری تو مر جائے لیکن وہ خود نہ مریں۔ اگر سنکھیا کم دیتا ہوں تو ان کی بیماری نہیں جاتی۔ زیادہ دیتا ہوں تو وہ خود مر جاتے ہیں۔"

"مرنا جینا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔" چیف منسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر الیکشن تو اپنے ہاتھ میں ہے نا۔ اس لئے آپ بس دیر نہ کیجئے۔ آپ اسی الیکشن میں کھڑے ہو جائیے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور....."

چنانچہ شری اُپا دھیائے جی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ پھر وزارت سازی کے موقع پر جب چیف منسٹر صاحب اپنی وزارت مرتب کرنے لگے تو انہیں اپنے آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ انہوں نے شری اُپادھیائے جی کو محکمۂ صحت کا وزیر بنا دیا۔ اور جنگل کا محکمہ بھی انہیں کے سپرد کر دیا کہ ہر طرح کی جڑی بوٹی کی دریافت جنگل ہی سے ہوتی ہے!

شری اُپادھیائے جی نے وزیر بننے سے بہت انکار کیا۔ ایک تو اُن کی دھرم پتنی گیارہ بچوں کے بعد پھر سے حاملہ تھیں۔ پھر ان دنوں وہ ایک مقامی رئیس اور کارخانے دار کی فرمائش پر سچے موتی اور جواہرات

والا بدھ مگر دھوج بنانے میں مصروف تھے۔ مگر چیف منسٹر صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی۔ بولے: "آپ یہ بھی تو سوچیے: اب تک جتنے وزیر میں لے چکا ہوں۔ کسی کی عمر ساٹھ برس سے کم نہیں ہے۔ اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ کسی کا سر ہلتا ہے تو کوئی دمہ میں مبتلا ہے۔ کسی کو ذیابیطس ہے تو کوئی ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے۔ اس لئے بھی وزارت میں کسی نہ کسی حکیم یا وید کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور......"

"بے شک، بے شک" چیف منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری نے سر ہلا کر کہا، اور شری اُپادھیائے جی وزیر بن گئے۔

شری اُپادھیائے جی وزیر تو بن گئے۔ لیکن وہ اس وزارت بازی سے خوش نہ تھے۔ ایک تو انہیں انگریزی یعنی اپنے دیش کی اصلی راشٹر بھاشا آتی نہ تھی۔ پھر وہ ہندی اور اردو بھی واجبی سی جانتے تھے۔ اس لئے وزارت کا سارا کام انہوں نے محکمے کے پرنسپل سکریٹری کو سونپ رکھا تھا۔ اور خود دوسرے وزیروں کے علاج میں لگے رہتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا تھا، کہ انہیں اپنی وزارت کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی؟

ایک روز سہ پہر میں جب آسمان کا رنگ عرق گاؤزبان کی

طرح شفاف تھا۔ اور زمین ترپھلا کی طرح زردی مائل اور بھورے رنگ کی ہو رہی تھی۔ اور شری اُپا دھیائے اپنی کھرل میں اصل کشتہ عنبری مرجان والا گھونٹ رہے تھے کہ چیف منسٹر کا پرائیویٹ سکریٹری ان کے پاس آیا، اور اُن کے کان میں کہنے لگا :

"ابھی چلئے، چیف منسٹر صاحب نے بلایا ہے۔ بے حد ضروری کام ہے!"

"کیا انہیں دل کا دورہ پھر پڑ گیا؟" اُپا دھیائے جی ایک دم متفکر ہو کر بول پڑے۔

"نہیں دورہ نہیں ہے!" پرائیویٹ سکریٹری جلدی سے بولا۔

"تو پھر میں کونسی دوا اپنے ساتھ لے چلوں۔ جلدی سے بتائیے انہیں کیا بیماری ہے؟"

"کوئی بیماری نہیں ہے۔" پرائیویٹ سکریٹری نے ذرا پریشان ہو کر کہا "ایک سرکاری کام ہے"

"سرکاری کام ہے تو میرے محکمے کے پرنسپل سکریٹری شری جتندر ناتھ کندرا کو بلا لیجئے۔ میرے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ دیکھتے نہیں، میں اس کھرل میں کیسی قیمتی دوا گھوٹ رہا ہوں۔"

چیف منسٹر کے پرائیویٹ سکریٹری نے بڑی خوشامد کی۔ آخر

بڑی مشکل سے اُپا دھیائے جی جانے کے لئے تیار ہوئے۔

جب اُپا دھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہونچے، تو وہاں خوشامدیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بڑی مشکل سے چیف منسٹر صاحب نے اُن سے چھٹکارا پایا۔ اور پھر شری اُپا دھیائے جی کی طرف متوجہ ہوتے بولے:

"وزارت خطرے میں ہے!"

"کس کی؟" اُپا دھیائے جی نے پوچھا: "میری یا آپ کی؟"

"سب کی! — اور اگر اس وقت آپ نے میری مدد نہ کی تو مارا جاؤں گا۔"

"اُپا دھیائے جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا: میں آپ کا اپنا آدمی ہوں، آخر کس دن کام آؤں گا۔ اس کم بخت کا نام آپ بتا دیجئے جس نے آپ کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ میں شہر کے دو چار غنڈوں کو جانتا ہوں — چاقو کے ایک ہی وار میں......"

"نہیں نہیں، اُپا دھیائے جی۔ آپ بات کو سمجھے نہیں! غنڈوں کے کئے سے یہ کام نہ ہوگا۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہوگا۔"

اُپا دھیائے جی کانپ گئے۔ "یہ کام تو آج تک کبھی نہیں کیا۔ آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ لیکن کسی کی جان لینا — !!"

چیف منسٹر صاحب ہنس کر بولے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میں کہاں کسی کی جان لینے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تو ایک سرکاری کام کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"کیسا کام ہے؟"

"قومی بچت!"

"قومی بچت؟"

"ہاں قومی بچت۔ آج کل قومی بچت کا خیال مرکزی سرکار کے سر پہ بھوت بن کر سوار ہے۔ گذشتہ ایک مہینے سے برابر چٹھیاں آ رہی ہیں۔ سرکاری، نیم سرکاری۔ ٹرنک کال۔ ہر لمحہ مجھے دھمکی دی جا رہی ہے کہ اگر میں نے قومی بچت کے کام کو سنجیدگی سے پورا نہ کیا تو میری وزارت بدل دی جائے گی۔"

"یہ قومی بچت کیا ہوتی ہے؟" اُپادھیائے جی نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ وہ بچارے سرکاری کاموں سے ہمیشہ کتراتے تھے۔

"مطلب یہ ہے اُپادھیائے جی کہ سرکاری کام میں بچت کرنا سرکاری خرچ میں کمی کرنا۔ اگر دس روپے کا کام ہو تو اسے پانچ روپے میں پورا کر لینا۔ اگر کام میں دس آدمیوں کی ضرورت ہو تو اسے دو آدمیوں سے چلا لینا۔ اس طرح کی تکڑم کو قومی بچت کہتے ہیں۔"

اُپادھیائے جی سوچ سوچ کر بولے : "تو آپ وزیروں کی تنخواہیں کم کر دیجئے"۔

"وزیروں کی تنخواہ پہلے ہی کم ہو چکی ہے۔ اب اور کیا کم ہوگی!" چیف منسٹر چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔

"تو آپ ایک وزیر ہی کم کر دیجئے۔ میرا استعفےٰ حاضر ہے ۔۔۔!" اُپادھیائے جی فوراً خوش ہو کر بولے۔

"مگر ایک وزیر کم کرنے سے کیا ہوگا اُپادھیائے جی"۔

"تو ..... تو ...... دیکھئے میرے محکمے میں پندرہ کے قریب سکریٹری صاحبان ہوں گے، گھٹا کے سات کر دیجئے"۔

"سات آدمیوں کی بچت سے بھلا کیا ہوگا"۔ چیف منسٹر صاحب اُداس ہو کر بولے "اور نیچے جائیے!" چیف منسٹر نے مشورہ دیا۔

اُپادھیائے جی سکریٹری کی سطح سے نیچے اتر کر سوچنے لگے بولے: "تو محکمے کے سپرنٹنڈنٹ آدھے کر دیجئے۔ ساٹھ کے تیس رکھئے!"

"تیس کی بچت سے بھی کیا ہوگا۔ اور نیچے جائیے ۔۔۔ اور نیچے ....."

اُپادھیائے جی اور نیچے گئے۔ کلرکوں تک پہونچے تو چیف منسٹر

کا دل ذرا خوش ہوا۔ اور جب چپراسیوں پر پہونچے تو چیف منسٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے فوراً اُپا دھیائے جی کو گلے لگا لیا۔ بولے۔ "اب آپ کچھ کچھ وزیر ہوتے جا رہے ہیں۔ دراصل ہم لوگوں — ہم وزیر لوگوں کو بہت نیچے اتر کر عوام کی سطح پر سوچنا چاہئے۔ آپ ایک کام کیجئے میرے خیال میں آپ کا ایک دورہ بھی ہو جائے!"

"دورہ؟ مجھے تو دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں"

"میرا مطلب علاقے کے دورے سے ہے۔ آپ نین تال کا ایک چکر لگا لیجئے۔ اب تک آپ نے اپنے علاقے کا دورہ تک نہیں کیا۔ اِس سے دوسرے وزیروں کو آپ سے شکایت پیدا ہو چلی ہے۔ لہٰذا آپ نین تال کا دورہ کر آیئے۔ اور وہاں بیٹھ کر قومی بچت کے سلسلے میں اپنی تجاویز ٹھیک طرح سے سوچ لیجئے۔ اور اگر ہو سکے تو وہاں مقامی اداروں کو دیکھ کر اُن میں بھی بچت کر دیجئے۔ میں آپ کو پورا پورا اختیار دیتا ہوں، اِس سلسلے میں!"

باتیں کرتے کرتے سہ پہر سے شام ہو گئی۔

جب اُپا دھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی سے نکلے، تو انہوں نے نین تال جانے کا اور وہاں جا کر قومی بچت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ بے حد مسرور ہو کر چیف منسٹر کے بنگلے سے باہر نکلے۔ اس

وقت شام ہو چکی تھی۔ مغربی آسمان میں شفق کا رنگ شربت عناب کی طرح تھا۔ اور کہیں کہیں آسمان پر تارے تخم خربزہ کی طرح نکلے ہوئے تھے۔

محکمۂ جنگلات کے کنزرویٹر ٹھاکر ہنونت سنگھ بڑے عمدہ شکاری تھے۔ پرانے تجربے کار حکمراں تھے۔ انگریزوں کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے شری اُپادھیائے جی کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا ــــ تین تال کے بوٹ کلب میں انہیں شاندار دعوت دی۔ اور اُن کا مقابلہ ہندوستان کے پرانے ویدوں سے کیا۔

مہارانی آف باندی پور نے اُن کے اعزاز میں ایک محفل رقص منعقد کی۔ اور مہاراجہ گول مال پور انہیں جھیل پر مچھلی کا شکار کرانے لے گئے۔ جب یہ راؤنڈ پورا ہو چکا، اور شری اُپادھیائے نے تین تال کے جنگلات دیکھنے چاہے، تو ٹھاکر ہنونت سنگھ نے راجہ آف بانسی پور سے کہہ کر ایک ہاتھی کا بندوبست کیا اور ٹھاکر تین تال کے ترائی کے جنگلوں میں سیر کے لئے پھرے۔

ٹھاکر ہنونت سنگھ کو شکار کا بہت شوق تھا ۔ انگریزوں کے وقت میں چیف کنزرویٹر کو جنگل کی سواری کے لئے ایک ہاتھی ملتا تھا لیکن قومی حکومت کے آنے سے ہاتھی بچت میں آگیا ۔ اس کا بھی ٹھاکر ہنونت سنگھ کو بہت غم تھا ۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے ۔ دو چار بار انہوں نے کوشش کی ۔ ایک مرتبہ خود چیف منسٹر سے کہا لیکن ہاتھی برابر تخفیف میں رہا ۔

شری اُپادھیائے جی کو شکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ اس لئے جنگل میں گھومتے گھومتے جب ٹھاکر ہنونت سنگھ " ہائے وہ چیتا نکل گیا " کہہ کر ہاتھ ملتے تو شری اُپادھیائے زور سے چلا پڑتے ،

" ارے وہ جھاڑی آپ نے دیکھی ؟ "

" کونسی ؟ " ـــ ٹھاکر ہنونت سنگھ اپنے دل پر قابو پاتے ہوئے پوچھتے ۔

" وہ ـــ جس پر چھوٹے چھوٹے سنہرے رنگ کے پھول لگے ہیں ـــ ! "

اس کے بعد شری اُپادھیائے جی ہاتھی رکوا کر نیچے اُترتے اور جنگل سے بوٹی توڑ کر ٹھاکر ہنونت سنگھ کو دکھاتے ، اور کہتے :

" دیکھئے ، عام لوگ اسے (کٹ پیڑا) کہتے ہیں ۔ مگر میرا کرت

میں اسے پڑی کسٹ کہتے ہیں ۔ سنسکرت میں یہ ریڑکرک ہے ۔یونانی
میں یہ باز کلیلہ ہے!"

"عجیب جمیلہ ہے!" ٹھاکر جی حیرت سے بولے "کیوں کہ
میرے خیال میں تو یہ آملے کا پیڑ ہے"

"جی ہاں! وہی تو ہے ــــ مگر بڑے کام کی چیز ہے ــــ اس
کے فائدے ــــ؟"

اس کے بعد شری اُپادھیائے جی نے پھر ہاتھی پر سر چڑھ کر
جو آملے کے فائدے گنانے شروع کئے تو جی، جی، جی، کہہ کر ٹھاکر
ہنونت سنگھ پر کچھ غنودگی طاری ہونے لگی۔

اتنے میں ٹھاکر صاحب نے جھاڑی کے پیچھے ایک ریچھ دیکھا
اور مارے خوشی کے پھر اپنی رائفل سیدھی کی کہ یکایک اُپادھیائے جی
نے زور سے چلا کر کہا۔

"ہاتھی روکئے، ہاتھی روکئے!"

ٹھاکر ہنونت سنگھ نے دانت پیس کر اپنی رائفل نیچے کرلی،
اور بولے:

"نیچے تو ریچھ ہے"

اُپادھیائے جی ہنس کر بولے۔"نہیں ٹھاکر جی نیچے ایک بوٹی

بلی اور وزیر

. نہایت نایاب بوٹی مجھے نظر آگئی ہے ۔ دیکھئے وہ ہاتھی رکئے

اُتر کر آپ کو دکھاتا ہوں "

جب تک ریچھ بھاگ گیا تھا ۔

ٹھاکر صاحب نے دل ہی دل میں تو جانے کیا کچھ کہا ہوگا مگر ہر بڑے تحمل سے ہاتھی رکوایا ۔ اُپا دھیائے جی نیچے اُترے اور سوکھی مٹری جھاڑی کے پاس جا کر رک گئے اور بولے ،

" دیکھئے ، یہ ہے وہ نایاب بوٹی ! یہ سکمارل بوٹی ہے ، جسے اکرت میں کھمارل کہتے ہیں ۔ سنسکرت میں ڈک مارل ' یونانی میں ن خطوط ۔ لاجواب بوٹی ہے ۔ اس کی جڑ کو اگر تین سال آملے کے س میں بھگو کر تپ دق کے مریض کو کھلایا جائے تو وہ دو دن میں اچھا جائے "

ٹھاکر ہنونت سنگھ کے دل میں خیال تو آیا کہ تین سال تک ن جب تک یہ بوٹی آملے کے رس میں بھیگتی رہے گی ، اس وقت تپ دق کا مریض کیا کرے گا ؟ — مگر وزیروں سے اس طرح سوال کرنا قومی جمیعت کے خلاف ہے ۔ بلکہ سوال نہ کرنا ایک طرح قومی یکجہتی ہی ہے !

سات دن کے دورے کے بعد شری اُپادھیائے نرائن کے جنگلوں

سے واپس آکر پھر نینی تال میں ٹک گئے۔ اُن کی صحت بہتر ہوگئی تھی، اِس کے علاوہ انہوں نے ہلدی، زیرہ، آملہ، بنفشہ اوراسی قسم کی سوڈیڑھ سو بوٹیاں اکٹھی کرلی تھیں۔ ٹھاکر ہنونت سنگھ کا ٹرپ بھی بُرا نہ رہا۔ وزیرِ صحت کی مداخلت بےجا کے باوجود انہوں نے دو چیتے شکار کرلئے تھے۔

شری اُپادھیائے ٹھاکر ہنونت سنگھ کے کام سے بے حد خوش ہوکر بولے "ٹھاکر جی، آپ کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

ٹھاکر جی بولے "حضور سب ٹھیک ہے۔ سب اچھا ہے۔ بہت ہی اچھا چل رہا ہے۔ بس ایک تکلیف ہے۔ اور وہ یہ کہ ترائی کے جنگل تو خود آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ ان جنگلوں میں جب گھوڑے پر سوار ہو کر دورے کو جاتا ہوں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

"مگر مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی!" اُپادھیائے جی حیرت سے بولے۔

"آپ تو ہاتھی پر تھے نا!" ٹھاکر ہنونت سنگھ نے سمجھایا۔
"تو آپ بھی ہاتھی پر جایئے! کس نے آپ کو منع کیا ہے ــ ؟"
اُپادھیائے جی فوراً بولے۔
"کبھی کبھار اپنے رسوخ سے کسی راجہ مہاراجہ کا ہاتھی مانگ لیتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں، وہ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کبھی دیتے ہیں، کبھی نہیں دیتے۔ ہاتھی تو دراصل سرکاری ہونا چاہیے۔"
"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" اُپادھیائے جی سر ہلا کر بولے
اتنے گھنے جنگلوں میں ہاتھی کے بغیر جانا، سرکاری ملازم کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے!"
"بے شک، بے شک!" ٹھاکر ہنونت سنگھ بے حد سنجیدہ ہو کر بولے۔
"ہاتھی کتنے کا آئے گا؟" آخر اُپادھیائے جی نے سوچ سوچ کے پُوچھا۔
ٹھاکر ہنونت سنگھ بولے "اچھا ہاتھی دس ہزار میں آئے گا۔ مگر ان دنوں اتفاق سے راجہ آف بانسی پور کا ایک ہاتھی پانچ ہزار میں مل رہا ہے!"
"آپ لے لیجیے۔ میں منظوری دے دیتا ہوں۔"

ٹھاکر جی نے کاغذ تو پہلے ہی تیار کر کے جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ فوراً آگے بڑھا دیے۔ خود اپنا قلم پیش کیا۔ اور ایک لمحہ میں پانچ ہزار کا ہاتھی منظور ہو گیا۔

پھر ایسی دعوتوں، ٹی پارٹیوں کا سلسلہ چل نکلا، اور کچھ اس طرح کی مصروفیت رہی کہ اگلے دس روز تک اُپادھیائے جی کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے تھے۔ یکایک رات کو دھیان آیا کہ وہ تو یہاں قومی بچت کرنے کے سلسلے میں آئے تھے۔ سوچتے ہی اُن کے ماتھے سے پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ کیوں کہ آدمی سیدھے تھے اور نیک دل تھے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ سرکاری کام کیا مشکل کا ہوتا ہے۔

ناچار انہوں نے ٹیلی فون پر ٹھاکر صاحب کو بلایا، اور اُن سے کہا کہ وہ اپنے مقامی محکمے کے ملازموں کی تفصیل لے کر آئیں۔ قومی بچت کی جائے گی۔

رات کو ٹھاکر صاحب اپنے محکمے کی تفصیل لے کر پہونچ گئے،

شری اُپا دھیائے نے تفصیل دیکھ کر کہا — "آپ مجھے زبانی سمجھا دیجئے۔"

"دیکھئے، ایک تو میں ہوں۔" ٹھاکر ہنونت سنگھ بولے "آپ مجھے نکال سکتے ہیں۔"

اُپا دھیائے جی مسکرا کے بولے۔ "چلئے، چلئے، ایک آدمی کو نکال کر کیا ہوگا؟"

"دوسرے آدمی میرے دو ڈپٹی کنزرویٹر ہیں۔ جو چھ جنگلوں کو سنبھالتے ہیں۔"

"باپ رے! پھر تو ان کے پاس بہت کام ہوگا۔ آگے چلئے میرا مطلب ہے نیچے چلئے۔"

"نیچے چار اسسٹنٹ ڈپٹی کنزرویٹر۔"

"اور نیچے!"

"اکٹھا میں فارسٹ آفیسر۔"

"اور نیچے!"

"ساٹھ فارسٹ گارڈ۔"

"اور نیچے!"

"سات ریکارڈ کلرک۔"

"اور سنیے ؟"

"بلی کا دودھ ــــ نو روپے"!

اُپادھیائے جی یکایک رُکے۔ بولے ـــ" ہائیں! یہ بلّی کا دودھ کس لئے ؟"

ٹھاکر بھونت سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے تشریح کی"۔ ہمارے ریکارڈ آفس میں چوہے بہت ہیں، جو قریب کے جنگل سے آجاتے ہیں۔ اور ریکارڈ تلف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے سرکاری طور پر ہم نے ایک بلّی پال رکھی ہے جو ان چوہوں سے ہمارے ریکارڈ کو بچاتی ہے ـــ اس کے دودھ پر نو روپے ماہانہ خرچ ہوتے ہیں۔ بس ـــ!"

اُپادھیائے جی نے ایک دم غصے سے بھڑک کر کہا "مگر جب سات ریکارڈ کلرک ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کے لئے مامور ہیں تو اس بلی کی کیا ضرورت ہے؟

نو روپے!

نو روپے!!

خیریت ہے ٹھاکر صاحب، آپ اتنے جہاں دیدہ اور تجربے کار آفیسر ہو کر یہ نہیں دیکھ سکے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے قوم کی

گاڑھی کمائی کا قیمتی سرمایہ ایک جنگلی بلی کو دودھ پلانے میں صرف ہو رہا ہے ؟ "

ٹھاکر صاحب نے شرم سے سر جھکا لیا -

اُپادھیائے جی فیصلہ کن لہجے میں بولے "میں حکم دیتا ہوں کہ اس بلّی کو آج ہی سے ڈسمس کر دیا جائے !! "

"بہت بہتر ! " ٹھاکر ہنونت سنگھ فائل کو بند کرتے ہوئے بولے -

یکایک دروازے کے قریب سے ایک باریک سی آواز آئی ، اور اُپادھیائے جی اپنی کرسی سے اچھل پڑے -

"میاؤں !" دروازے پر ایک بلّی کھڑی تھی - اور حیرت سے وزیر کو دیکھ رہی تھی !!

وزیروں کا کلب

کناٹ پلیس کے گول چکر کے باہر ایک اور گول چکر شرنارتھیوں کی دوکانوں کا کھنچا ہوا ہے۔ دوکانیں زیادہ تر کھوکھے کی لکڑیوں، ٹین کی چھتوں یا ترپال کی دیواروں سے تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دوکانیں ڈھابہ نما ہوٹلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ سرکاری معاملات کے سلسلے میں عام لوگوں کو اکثر سرکاری دفتروں میں جانا پڑتا ہے۔ یہ لوگ طبعاً کمینے اور عادتاً غلیظ ہوتے ہیں۔ اس لئے نئی دلّی کے صاف ستھرے ہوٹلوں کا کھانا پسند نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ کنجوس اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ مائی لارڈ اور کلفٹن ایسے ہوٹلوں کے بڑے بل دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی

ضروریات کو مدنظر رکھ کر کناٹ پلیس کے چکر کے باہر یہ دوکانیں جنگلی جھاڑیوں کی طرح گویا خود بخود زمین سے اُگ آئی ہیں ۔۔۔ اِن دوکانوں میں آپ وہی بے ترتیبی، انارکی اور بدنظمی پائیں گے، جو خود رو جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ میں ہوتی ہے ۔ مجھے ان ڈھابہ نما ہوٹلوں سے سخت نفرت ہے جہاں تین آنے میں دو چپاتیاں مل جاتی ہیں ۔ اور دال مفت، پانی مفت اور بیٹھنے کے لئے کرسی اور میز تک مفت ۔ اگر غیر ملکی سیاح نئی دلّی کے ان غلیظ ڈھابوں کو دیکھ پائیں تو ہندوستان کے متعلق کیسی رائے قائم کریں ۔ اور آج کل لے دے کے اپنے وطن میں اپنی ایک خارجہ پالیسی ہی تو رہ گئی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں عزت سے لیا جاتا ہے ۔

ورنہ ہمارے ہاں ہے کیا ؟

عوام ہیں تو جاہل ۔

دوکان دار ہیں تو بے ایمان ۔

کلرک ہیں تو رشوت خور ۔

مزدور ہیں تو کام چور ۔

عورتیں ہیں تو فیشن کی دلدادہ !

لوگ ایسی بُری عادتوں کا شکار ہو چکے ہیں کہ غلیظ گھروں میں رہتے ہیں، پھٹے کپڑے پہنتے ہیں اور گندے بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔

یہاں کسی غیر ملکی سیاح کو دکھانے کے لئے ہے کیا ـــ؟

ایک تھا بیاکرٹہ ننگل ڈیم ـــ وہ مکمل ہی نہیں ہوا۔ یار لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اسے مکمل کر دیا گیا تو ہمارے پاس غیر ملکی سیاحوں کو دکھانے کے لئے رہ کیا جائے گا؟

اور دوسری ہے ہماری خارجہ پالیسی۔ جس کی وجہ سے ہمارا بھرم دوسرے ملکوں میں قائم ہے۔ اور یہ خارجہ پالیسی گویا نئی دلّی کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ بدصورت ڈھابے مین کناٹ پلیس کے سامنے موجود ہیں۔

جب تک یہ ڈھابے موجود ہیں، ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتی! میری ناچیز رائے میں تو ان ڈھابوں کو ڈھا دینا چاہیے ـــ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج کل جو کچھ میں کہتا ہوں اُس میں جملہ کم ہوتا ہے اور معترضہ زیادہ ہوتا ہے۔

میں اصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک روز کناٹ پلیس

کے باہر ایک تپتی دوپہر میں ٹین کی چھت کے نیچے اسی ڈھابے
میں بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔

مجھے یہ ڈھابے پسند نہیں ہیں، اور نہ میں ان میں کھانا پسند
کرتا ہوں ۔ میں ایک شریف، معقول، پڑھا لکھا آدمی ہوں ۔
بڑے بڑے آدمیوں سے میری ملاقات رہتی ہے۔ جن میں وزیر،
گورنر، لیڈر، مل اونر اور پنج سالہ پلان کے منیجر شامل ہیں ۔

جی نہیں، آپ نے غلط سمجھا۔ میں کسی محکمے میں ڈپٹی سکریٹری
نہیں ہوں ۔

سیمنٹ کا ٹھیکیدار بھی نہیں ہوں ۔

کسی وزیر کا بھانجا بھی نہیں ہوں ۔

نہیں نہیں، میری بیوی کسی پارلیمنٹ کی ممبر بھی نہیں ۔

میں تو آج کل ایک اخبار میں رپورٹر ہوں ۔ اور محض اس لئے
ذلیل ڈھابے میں کھانا کھانے پر مجبور ہوا کہ مجھے ہر روز سول
سکریٹریٹ میں کسی نہ کسی بڑے آدمی سے انٹرویو کے لئے جانا پڑتا ہے
اور میری جیب اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مائی لارڈ ہوٹل
میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں ۔ ورنہ ایمان کی کہئے مخمل کی کرسیاں،
اور چینی شاہ برجینی کی پلیٹوں میں سجا ہوا کھانا کسے پسند نہ ہوگا؟

"ہاں بھئی، آدھی پلیٹ دال کی اور بھی دے دو۔ اور یہ چپاتی تو بالکل جل گئی ہے۔ اسے بدل کے لاؤ۔"

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ اُفوہ کس قدر بُری عادت ہے میری۔ پڑا پڑا بے کار کی باتیں کیا کرتا ہوں۔ اس سے ایک تو اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اور پھر وقت کتنا برباد ہو جاتا ہے آپ نے کبھی غور کیا؟

آپ آدھے گھنٹے سے ایک ہی لقمہ منہ میں ڈالے اُلو کی طرح میرا منہ دیکھ رہے ہیں۔ نہیں نہیں، آپ خفا نہ ہوں۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کھانا بھی کھایئے۔ اور ساتھ ہی میری باتیں بھی سنتے جایئے۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک روز اس تپتی دوپہر میں اسی ڈھابے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ـــــ

ارے ذرا دیکھئے تو، یہ کون آدمی آپ کے عقب میں آ کے بیٹھا ہے۔ مُڑ کے دیکھئے۔ ارے دیکھئے ضرور مگر اس طرح تو نہ گھوریئے کہ دوسرا آدمی آپ کو سی۔آئی۔ڈی والا سمجھنے لگے۔ آپ نے اسے پہچانا؟ ذرا غور کیجئے۔ اپنے حافظے پر زور دے کر بتایئے۔ آپ نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مگر دعوے سے کہتا ہوں

آپ نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔
کچھ یاد نہیں آتا؟

دراصل اس میں آپ کا بھی اتنا قصور نہیں ہے۔ اس آدمی کی بڑھی ہوئی مونچھیں، جو اس کے لبوں پر گر رہی ہیں۔ اس آدمی کے میلے کچیلے کپڑے، یہ کھدر کی میلی غلیظ ٹوپی، اس کی کھٹی کھٹی تار تار مسکراہٹ سے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ آدمی کبھی اتر دکھن پردیش کا وزیر زراعت تھا۔ نہ صرف وزیر زراعت بلکہ جیل کا محکمہ بھی اسی کے پاس تھا۔ اور یہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان دونوں محکموں کو سنبھالنے کا اہل بھی تھا!

اس کا باپ موضع دھمال پور کا مشہور زمیندار تھا۔ اور وزیر بننے سے پہلے یہ آدمی سترہ بار جیل جا چکا تھا۔ جن میں سے پہلی بار تو ایک اغوا کے کیس میں پکڑا گیا تھا۔ دوسری بار اس پر ڈاکوؤں کی امداد کرنے کا الزام تھا۔ تیسری اور چوتھی بار اس پر سرکاری مالیے کے غبن کا مقدمہ چلا۔

اس کے بعد جو قومی تحریک چلی تو اس آدمی کا کردار بالکل ہی بدل گیا۔ یہ غنڈے سے نیک اور فرشتہ سیرت انسان بن

گیا۔ آخری بیرہ جیلیں اس نے قومی تحریک کے سلسلے میں کاٹی ہیں ___ !

میں جماعتی تضاد میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں انسان کے اندر ایک نیک روح ہوتی ہے۔ جسے اگر بیدار کر لیا جائے تو وہی انسان ایک فرشتہ بن جاتا ہے ___ کوئی جماعت بُری نہیں ہوتی۔ کوئی انسان بُرا نہیں ہوتا۔ یہ سب دل میں تبدیلی پیدا کرنے کی بات ہے۔ اور یہ بات الگ ہے کہ ہمارے ملک کے عوام جاہل ہیں۔ ان کے سر پر جب تک ڈنڈے نہ مارے جائیں وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ اور جو ہماری آپ کی طرح شریف لوگ ہیں اُن کے لئے لیڈر کا ایک اشارہ ہی کافی ہے۔

یہ سابق وزیر آج کل بہت بُری حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ دیکھئے اس کی چپل کتنی گھسی ہوئی ہے۔ اور اس کا کھدر کا پائجامہ کیسا بوسیدہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی مونچھیں ببول کے لعاب سے متواتر گیلی ہو رہی ہیں۔ اس لئے ان کا رنگ

کیا الجھا الجھا سا ہے۔ جیسے یہ مونچھیں بالوں کی نہ ہوں جوٹ کی ہوں
میرے خیال میں تو اس سابق وزیر کو اپنی مونچھیں رنگوا لینی چاہئیں،
ورنہ کوئی غیر ملکی سیاح ان مونچھوں کو دیکھ کر ہمارے ملک کی خارجہ
پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا؟

قسمت کی بات ہے صاحب کہ یہ وزیر آج کل اس ڈھابے
میں یوں مفلوک الحال بیٹھا ہے۔ دراصل اس میں اس کی قسمت کو
بھی اتنا دخل نہیں، جتنا اس کی حماقت کو۔ اور سچ پوچھو تو دیانتداری
بھی ایک طرح کی حماقت ہی ہے۔ یہ وزیر بے حد دیانت دار تھا۔ اس
لیے اس حال کو پہنچا۔ بھلا سیاست میں دیانت کا کیا دخل؟
سیاست میں تو دیانت نہیں دیکھی جاتی۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھا
جاتا ہے۔ عوام یہ دیکھتے ہیں کہ لیڈر کیا کہتا ہے۔ لیڈر یہ دیکھتے ہیں کہ
وزیر کیا کہتا ہے۔ وزیر یہ دیکھتے ہیں کہ چیف منسٹر کیا کہتا ہے چیف
منسٹر یہ دیکھتا ہے کہ باہر کے ملک کیا کہتے ہیں۔ اسی پر بھارت کی
ساکھ قائم ہے۔ تھوڑی سی پٹنی پیاز اور دھنیا۔۔

اس وزیر کا نام رگھو رام راؤ ہے۔ جب یہ اتر دکھن پردیش
میں وزیر تھا، تو میں اس کا انٹرویو لینے گیا تھا۔ اُس وقت اس کی
شان ہی الگ تھی۔ کھدر کا سفید براق جامہ، سر پر کھدر کی کشتی نما

ٹوپی یُوں اُونچی تن کے کھڑی تھی جیسے کسی نے اس کے اندر بانس کی پھچی ڈال کر کھڑا کیا ہو! یہی شبہ اس وزیر کی گردن پر بھی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جب میں اس سے انٹرویو لینے گیا تو اس کی اسٹینو بڑی خوب صورت لڑکی تی۔ اس کا قصہ الگ ہے۔ وہ پھر سناؤں گا۔ اس وقت مجھے اس حسین نازک اندام سنہری گھومے ہوئے بالوں والی لڑکی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اونچی ایڑی والی سینڈل پہنے ہوئے جب وہ ٹپ ٹپ کرتی ہوئی چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دفتر کے فرش پر ٹائپ کر رہی ہو۔ در اصل ہاتھوں سے زیادہ اس کے پاؤں ٹائپ کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب وہ کارکوں کی میزوں کے بیچ میں سے گذرتے ہوئے وزیر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر مسکراتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک متبسم ڈرافٹ کی مختلف کاربن کاپیاں فضا میں بکھر رہی ہیں۔

اُس دن وزیر نے مجھے بہت لمبا انٹرویو دیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اسمبلی میں اس کا مشہور و معروف زرعی بل پیش ہونے والا تھا وہ انٹرویو کے بیچ میں بار بار سگار پیتا تھا۔ ایک معطر رومال سے۔۔۔شدہ اور ہاتھوں سے بنے ہوئے کھدر کا رومال جیب سے نکال کر اپنا ماتھا پونچھتا تھا، اور اس طرح دزدیدہ نگاہوں سے اپنی حسین اسٹینو کو

دیکھتا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی دلچسپ راز مشترک ہو۔ اور وہ کافرادا بھی یوں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی جیسے اس نے اپنے لبوں کے پیچھے کسی نئی مسکراہٹ کا رین فنڈ کیا ہو۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ ایک عورت میں اور ایک ٹائپ رائٹر میں کیا فرق ہے؟

ذرا گڑ گڑاؤ۔ مسکراہٹ باہر!

نہیں صاحب میں عورت کا دشمن نہیں ہوں۔ میں قنوطی بھی نہیں ہوں۔ میں عورتوں، ٹائپ رائٹروں، ایڈروں، وزیروں، سوشل ورکروں اور جنتا سیوک سماج کا بے حد معترف ہوں۔ بس مجھے اگر ان سے گلہ ہے تو اپنے ملک کے جاہل عوام سے۔ میں کیا بتاؤں کہ کس قدر کوڑھ مغز ہیں یہ لوگ۔ اپنا بھلا برا سمجھنے کی توفیق بھی نہیں رکھتے۔

آپ خود ہی سوچئے وزیر رگھو رام نے جو زرعی بل اسمبلی میں پیش کیا تھا وہ کس قدر انقلابی ذہنیت کا حامل تھا۔ اگر وہ پاس ہو جاتا تو ہمارے ملک کے عوام کو کتنا فائدہ ہوتا۔ اور باہر کے ملک بھی اس بل کے پاس ہونے سے کس قدر خوش ہوتے مگر ہوئے کیا بات ہوئی

کسی کا دھیان ہی نہیں گیا اس طرف ۔ حالانکہ وزیر زراعت نے بہت عمدہ بل پیش کیا تھا ۔ اور ان کی زرعی اصلاحات کا سارا مقصد یہ تھا کہ زمین کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے :

آپ کو سُن کر تعجب کیوں ہو رہا ہے ۔ بالکل یہی مقصد تھا اس زرعی بل کا ۔ یعنی زمین کسانوں سے لے لی جائے ، اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے .....!!

میں اِسی سلسلے میں وزیر زراعت سے انٹرویو لینے گیا تھا ۔ گو بات مجھے بھی ذرا عجیب سی لگی تھی کہ اس زمانے میں جب چاروں طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ زمین زمینداروں سے لے کر کسانوں میں بانٹ دی جائے ۔ اُس وقت ایک من چلا ایسا اٹھتا ہے جو بیانگِ دہل ـــــ بیانگِ دہل آپ سمجھتے ہیں نا ؟ نہیں تو گھر جا کر ڈکشنری دیکھئے گا ـــــ جو بیانگِ دہل اسمبلی میں یہ بل پیش کرتا ہے کہ زمین زمینداروں سے نہیں بلکہ کسانوں سے لے لی جائے ، اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے ۔

اس سلسلے میں جب میں نے وزیر زراعت رگھو رام رائے ترپاٹھی سے استفسار کیا تو اس نے مجھے ایسا شافی جواب دیا ، کہ

طبیعت پر آج تک اس کا اثر باقی ہے۔

رگھو راج نے کہا: "دیکھئے یہ بات کس قدر غلط ہے کہ پہلے تو ہم زمین زمین داروں سے لیتے ہیں" اور اس طرح شرفا کے ایک طبقے کو ختم کرتے ہیں۔ یہ طبقاتی نفرت ہمارے سرکاری دستور کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ہم اس پر بس نہیں کرتے۔ ہم یہ زمین زمینداروں سے لے کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کسانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ زمین کی یہ "ٹکڑے سازی" ہماری زرعی پیداوار کو اور بھی کم کرائے دیتی ہے اور اس کے بعد جب ہمیں اس کا احساس ہونے لگتا ہے تو ہم کوآپریٹو تحریک چلاتے ہیں۔ یعنی اس زمین کو جو مختلف کسانوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ گئی تھی، پھر سے اکٹھا کرتے ہیں یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

بھئی ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھر سے اکٹھا کرانے سے تو یہی بہتر ہے کہ زمین زمینداروں کے پاس رہے۔ زمینداری جو ہے وہ گویا ایک طرح کا کواپریٹو سسٹم ہی تو ہے۔ میرے موضع دھمال پوری کو لے لیجئے۔ یہ ہمارا جدی پشتینی گاؤں ہے۔ لیکن ہمارے موضع کے سارے کسان اس میں مل کے ہل چلاتے ہیں! مل کے بیج بوتے ہیں! فصل اگاتے ہیں! فصل کاٹتے ہیں۔ یہ کواپریٹو تحریک نہیں

ہے تو اور کیا ہے ؟

میرے والد اپنی آنکھوں کے سامنے سب کام کراتے تھے، اور جو بدمعاش کسان چول چرا کرتا تھا، اُسے فوراً بے دخل کر دیتے تھے۔ آج کل عجیب حالت ہے۔ کسان کتنا نِکما، پھسڈی، کاہل اور کام چور کیوں نہ ہو، کوئی اسے اس کی زمین سے بے دخل نہیں کر سکتا ہے۔ حالانکہ میرے ایسے اعلیٰ پوزیشن کے وزیر سے روز جواب طلبی ہوتی رہتی ہے :

تم نے اپنے بھائی کو فلاں جگہ پر کیوں تعینات کر دیا؟

اور اپنے بھتیجے کو فلاں پوسٹ کیوں دے دی؟

ایک وزیر کو کسی وقت بھی اس کی وزارت سے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک معمولی، جاہل، اَن پڑھ، مذہبی توہمات اور اندھے اعتقادات کے مارے ہوئے کسان کو کبھی اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کوئی انصاف ہے؟

پھر دیکھئے جب سے زمین داروں سے زمین چھینی جا رہی ہے زرعی پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسان پہلے سے زیادہ نکمے اور کاہل ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ اب ان کے سر پر زمیندار کا ڈنڈا نہیں ہے نہ صرف

زرعی پیداوار کم ہوگئی ہے بلکہ اناج کی قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں ایمان کی بات کہئے، دھرم کی بات کہئے ذرا پچیس تیس برس بلکہ چالیس برس پہلے کے زمانے میں جائیے۔ جب کہ کسانوں کی یہ غلط تحریک ہمارے ملک میں نہ چلی تھی۔

دیکھئے اس وقت بھی زمین زمینداروں کے پاس تھی، لیکن ہمارا ملک کس قدر خوش حال تھا۔ ہمارے کسان کس قدر مزے سے رہتے تھے۔ اناج کس کثرت سے پیدا ہوتا تھا۔ اور کتنا سستا بکتا تھا۔ چاول روپے کا سولہ سیر تو ہم نے لے کر کھایا ہے۔ گندم روپے کی تیس سیر آتی تھی۔ مکئی روپے کی سوا من بکتی تھی۔ تین آنے سیر دودھ تھا۔ گھی روپے کا چھ سیر بکتا تھا۔ آٹا روپے کا پندرہ سیر مل جاتا تھا۔ آج کل آٹا تو کیا لکڑی کا برادہ بھی اس بھاؤ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ ابھی لکڑی کا برادہ تو کیا، اگر آپ اپنے مکان کی تعمیر کے لئے باہر سے ریت لانے جائیں تو وہ بھی اس بھاؤ نہیں مل سکتی۔ مجھے معلوم ہے۔ میں آج کل ڈپلومیٹک انیکلو ژی دہلی میں اپنی کوٹھی تعمیر کرا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ریت کس بھاؤ ملتی ہے۔ سیمنٹ تو خیر کوٹے سے مل جاتا ہے۔ گورنمنٹ اگر ریت کا بھی کوٹا کردے تو ممکن ہے بات کچھ بنے۔ مگر مرکزی حکومت کو اس کی فکر کیا ہے۔ کلچر کے لئے

وزارت الگ بنا دی ہے۔ یہ کلچر و لچر سب بکواس ہے۔ میرے خیال میں تو مرکز کو جلد سے جلد ریت کی وزارت کھول دینی چاہیے کب سے میری کوٹھی کا کام ریت کے نہ ہونے سے رُکا پڑا ہے!"

"تو اس لئے ریڈ صاحب!" رگھو رام رائے ترپاٹھی دھمال پوری وزیرِ زراعت اور جیل خانہ دپیڑ خانہ نے میری طرف اپنی کرنجی آنکھیں گھما کر کہا:

"اس لئے میں یہ زرعی بل آج اسمبلی میں پیش کر رہا ہوں تاکہ زمین پھر سے زمین داروں کو مل جائے اور ملک میں اناج سستا ملنے لگ جائے۔ اور ہمارے کسانوں کے لئے وہی خوش حالی کا دور آ جائے جو آج سے چالیس برس پہلے اس ملک میں تھا۔"

"ہیئر ہیئر!!" میں نے پرجوش انداز میں تالی بجائی۔ وزیر کی تقریر واقعی مدلل اور نئے فکر کی حامل تھی۔ بعد ازاں اسمبلی میں جو اس نے تقریر کی وہ اس سے بھی بہتر تھی۔

مگر عین موقع پر جانے کیا ہوا کہ چیف منسٹر جس نے وزیرِ زراعت کو امداد کا یقین دلایا تھا عین وقت پر اسی چیف منسٹر کا گروپ اپوزیشن سے مل گیا، اور یہ بل پاس نہ ہو سکا۔

چیف منسٹر کو دوبارہ وزارت کی تشکیل کرنا پڑی۔ جس میں

اب کے انہوں نے رگھو رام راسے ترپاٹھی کو نہ لیا۔ ترپاٹھی جی نے دلی میں آکے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے۔ مرکزی حکومت سے بگڑوم لڑانے کی بہت سی کوششیں کر ڈالیں۔ مگر کوئی نسخہ بار ور نہ ہوئی۔ اس وزیر کا موضع دھمال پور بھی اس سے چھن گیا۔ گویا یہ آدمی اپنی وزارت سے گیا۔

اب آج آپ اسے اس ذلیل ڈھابے میں جلی ہوئی تندوری چپاتی نکالتے ہوئے دیکھ رہے ہیں —— ایسے میں اگر کوئی غیر ملکی سیاح ہمارے سابق وزیر کو اس حالت میں دیکھ لے تو ہماری خارجہ پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے ؟

مگر اصل میں اس وزیر کا جو قصہ میں آپ کو سنانے لگا تھا، وہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ یہی نہیں وہ اسٹینو گرافر حسینہ کا قصہ بھی اس وقت نہیں سناؤں گا۔ اس کے لئے شام کا وقت بہتر ہوگا جب بیئر کا سنہرا کف آلود سیال شفاف جام میں چھلکتا ہو، اور بتیاں روشنیوں کا نور کسی کے سنہری بالوں پر دمکتا ہو۔ اور کوئی آہو چشم دل نواز میری بغل میں بیٹھا ہو اور دل آپ ادا کر رہے ہوں۔ وہ قصہ اس وقت سنانے کا نہیں ہے۔ اس وقت تو میں آپ کو اس وزیر کی دوسری ملاقات کا حال سناتا ہوں :

وزیروں کا کلب

جب رگھورام اپنی وزارت سے برطرف کر دیا گیا، اور دہلی پہونچا، اور یہاں کوشش کر کے بھی وزارت دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہا، تو اس نے نئی دلّی میں وزیروں کا کلب کھول لیا —— جی ہاں وزیروں کا کلب اس نئی دلّی میں —— وہ جہاں آرنیا ہوٹل ہے نا، اس کے بالکل سامنے کی بلڈنگ میں کھلا تھا۔ اس کلب کی داستان بھی بے حد دلچسپ ہے۔

میں ابھی آپ کو سُناتا ہوں۔ ذرا میرے لئے آدھی پلیٹ مرغ کی آرڈر دیجئے۔ مگر خیال رہے کہ اس میں ایک ٹکڑا تو مرغ کی ٹانگ کا ہو، دوسرا ٹکڑا سینے کا ہو۔ مجھے مرغ کی ٹانگ اور اس کا سینہ بہت پسند ہے۔

کیا کہا آپ نے؟ مغرب میں عورت کو بھی اسی معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ یعنی اس کے سینے سے اور ٹانگ سے؟ صاحب آپ نہایت عورت زدہ انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ ہندوستان ہے۔ جس کا پڑوسی پاکستان ہے۔ جس کا پڑوسی افغانستان ہے۔ مغرب کی غلاظت یہاں مت بکھیریئے۔ ہم لوگ ایک روحانی خطّے کے رہنے والے ہیں، مغرب کی مادّیت یہاں نہیں چلے گی جو مرغ اور عورت کو ایک ہی معیار

سے پرکھتی ہے۔ چلئے مرغ نہ سہی سالن والا گوشت ہی منگائیے۔

ہاں تو ایک روز میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا ہوا پروف پڑھ رہا تھا کہ نائب مدیر نے ایک دعوتی رقعہ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا: "کناٹ پلیس میں آج شام کے چھ بجے وزیروں کا کلب کھل رہا ہے۔ آپ اس کی رپورٹ لے آئیے۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ یہ وزیروں کا کلب کیا بلا ہے؟۔ کارڈ دیکھا: واقعی آج وزیروں کے کلب کا اُدگھاٹن ہو رہا تھا۔ شری گُدگُد اچاریہ مرکزی وزارت کے سابق کامرس منسٹر اس کا افتتاح کر رہے تھے۔

وزیروں کا کلب؟ —— بات اچنبھے کی تھی۔ لیکن جب میں نے کارڈ کے نیچے سکریٹری کا نام پڑھا تو چونک گیا۔ آر، ایس، وی، پی، سکریٹری رگھورام رائے ترپاٹھی دھمال پوری سابق وزیر زراعت اُتری دکھن پردیش رئیس زادہ و جیل یافتہ (دس نمبری یار) —— اُس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے، اور افتتاح چھ بجے تھا۔ میں نے اُسی وقت سائیکل اٹھایا، اور وزیروں کے کلب میں پہونچ گیا۔

وزیروں کا کلب بہت عمدہ سجا ہوا تھا۔ پردے، لگاؤ، تکیے، تخت پوش، دیوان دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہینڈلوم انڈسٹری

کی نمائش ہو رہی ہے۔ کاغذی پھولوں اور ربڑ کے رنگین غباروں سے سجے ہوئے مرکزی ہال کے ایک طرف نیرا بار تھا۔ جہاں صرف نیرا دستیاب ہوتی تھی۔ تمباکو نوشی کے کمرے میں صرف بیڑی پی جا سکتی تھی۔ اور کھیلوں کے کمرے میں صرف شطرنج کھیلی جا سکتی تھی۔

رگھو رام مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ اب کے وہ وزیروں کا لباس اچکن اور چوڑی والا پائجامہ پہنے ہوئے نہیں تھا، بلکہ کھدر کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر گاندھی ٹوپی تو تھی، لیکن اس کا رنگ اب سرخ تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا:

"میں نے اپنی پارٹی سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اب سوشلسٹ پارٹی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر وہاں کامیاب نہ ہوا تو کمیونسٹ پارٹی میں جاؤں گا۔ اور اگر وہاں بھی کامیاب نہ ہوا تو اپنی پارٹی الگ بناؤں گا! لیکن فی الحال تو میں نے وزیروں کا کلب کھول لیا ہے۔ جب مجھے وزارت سے الگ کیا گیا تو مجھے کوئی نہ کوئی کام تو ضرور کرنا تھا۔ اس لئے سوچ سوچ کے میں نے نئی دلی میں وزیروں کا یہ کلب کھول دیا ہے۔ اس کا ہر وہ شخص ممبر

ہوسکتا ہے جو کبھی مرکزی وزارت یا صوبائی وزارت میں وزیر، نائب وزیر یا ڈپٹی نائب وزیر رہ چکا ہو۔ مقصد اس کلب کا ہے سابق وزیروں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی بحالی۔ میں کہتا ہوں اگر ہماری حکومت شرنارتھیوں کی بحالی کے لئے ایک وزارت قائم کر سکتی ہے تو سابق وزیروں کی بحالی کے لئے بھی ایک الگ وزارت کیوں نہیں قائم کرتی؟"

رگھورام نے زور سے منہ پر مکا مار کر بڑی سختی سے انگریزی میں کہا:

"There should be a separate ministry for the rehabilitation of minis-ters"

(وزیروں کی بحالی کے لئے لازماً ایک الگ وزارت ہونی چاہئے)

"بے شک! بے شک!!" میں نے سر ہلا کر پنسل سے اپنی نوٹ بک پر لکھتے ہوئے کہا۔

وہ میری حمایت سے بے حد خوش ہوا۔ رازدارانہ لہجے میں میرے کوٹ کا بٹن پکڑ کر کہنے لگا:

"ہمارے کلب کے تین سو ممبر بن چکے ہیں، اور آئندہ دو ڈھائی سو کے قریب اور ممبر بن جائیں گے۔"

"اور اگر تم ——" میں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔" اس کلب کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر دو اور ایک فرانس میں، تو کیسا لطف آئے؟"

"واہ واہ! تم نے کیا عمدہ بات سمجھائی ہے مجھے؟" رگھو رام نے میرے کوٹ کا بٹن توڑ کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔" پھر ہم سابق وزیروں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس بلا سکتے ہیں پیرس میں —— ارے ہنستے ہو —— پیرس میں!؟"

"پیرس کا ذکر آتے ہی رگھو رام راشے کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ چند لمحوں کے لئے چپ رہا، گویا دل ہی دل میں پیرس کی انٹرنیشنل کانفرنس کے مزے لے رہا ہو۔ پھر یکا یک اسے کچھ یاد آیا۔ اُس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اور جلدی جلدی کہنے لگا:

"اُو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ شری گدگدا چار بجے آنے والے ہیں۔ تم بھی چلو بڑے ہال میں!"

وہ مجھے چھوڑ کر جلدی سے بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ہال میں جوق درجوق سابق وزیر داخل ہو رہے تھے۔ ہر صوبے ہر نسل، ہر رنگ، ہر قوم اور ہر زبان کے وزیر تھے۔ شمال کے وزیر اور جنوب کے وزیر، مشرق کے وزیر اور مغرب کے وزیر، لمبے وزیر اور چھوٹے وزیر، کالے وزیر اور گورے وزیر، گندمی وزیر اور سانولے وزیر، صحت مند وزیر اور بیمار وزیر۔ وزیروں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔

جب سارا ہال سابق وزیروں سے بھر گیا تو رگھو رام رائے ترپاٹھی نے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی رپورٹ پیش کی۔ وزیروں کے کلب کے اغراض و مقاصد بیان کئے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے حکومت کے کام پر بھی کڑی تنقید کی جو ہر وزیر، وزیر بننے سے پہلے اور وزارت چھن جانے کے بعد کیا کرتا ہے۔ لیکن رگھو رام رائے کی تنقید تخریبی نہ تھی، تعمیری تھی۔ مجھے اس میں دو تین باتیں بہت دلچسپ اور غور طلب معلوم ہوئیں

ایک تو اس نے پنج سالہ منصوبے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کا اور غیر ملکی زرمبادلہ کا کروڑوں روپیہ فولاد کے کارخانے ڈھالنے میں برباد کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہم بڑی آسانی سے خام لوہا نکال کے، باہر کے ملکوں کو بیچ کر وہاں سے ڈھلا ڈھلایا فولاد

حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس فولاد کی مشینیں بنا سکتے ہیں۔ اس طرح سے ہم اس کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی رقم کو بچا سکتے ہیں جو یہاں فولاد کے مختلف کارخانے قائم کرنے کے سلسلے میں تیار کی جا رہی ہے۔

زرعی سُدھار کے سلسلے میں بھی اُس نے بے حد دلچسپ بات کہی۔ زرعی بل کے ناکام ہو جانے کے بعد رگھو رام رائے نے ایک زیرک آدمی کی طرح اپنا عقیدہ بدل دیا تھا۔ اب نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ زمین کسانوں میں بانٹ دی جائے نہ یہ چاہتا تھا کہ زمین زمینداروں میں بانٹ دی جائے۔ اب وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کسان زمینداروں میں بانٹ دیئے جائیں!!

میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُفوہ! کس قدر انوکھا اور اچھوتا خیال ہے زرعی انقلاب کا۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایسے وزیر کو معزول کر دیا گیا ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں حکومت کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ اور وہ اسے پھر وزیر بننے کا موقع دے گی۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سارا ہال تالیوں سے گونج گیا معلوم ہوا کہ رگھو رام رائے کی تقریر ختم ہو چکی تھی، اور اب سکریٹری کے

اسرار پرشری گُدگُدا چاریہ اسٹیج پر کلب ادگھاٹن کرنے کے لئے تشریف لے آئے تھے۔

شری گُدگُد کو دیکھ کر نہ معلوم میرے ذہن میں کیوں بُدھ بُھم یا کلنگھ کی صورت اُجاگر ہوتے لگتی تھی۔ حالانکہ ان دونوں جانوروں کا دُور دُور تک ایسے دانش مند انسان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

شری گدگدا چاریہ نے اسٹیج پر آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کیا۔ اپنی دھوتی کا سرا ٹھیک کیا۔ اپنے داہنے ہاتھ کو ایک خطرناک تہدیدی انداز میں فضا میں گھما کے کہا :

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

وہ مزید کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ کلب کا ایک چپراسی (جو اپنے اچھے زمانے میں اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا، یعنی جب اس کا چچا وزیر ہوا کرتا تھا) دوڑا دوڑا ڈائس پر آیا، اور جلدی سے اس نے ایک کاغذ کا پرزہ شری گدگد آچاریہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا، اور وہ بے حد گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

شری اچاریہ نے بڑے اطمینان سے اپنی عینک کو ناک پر سرکاتے ہوئے اس کاغذ کے پرزے کو دیکھا، پھر مسکرا کر بولے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

پیشتر اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں، ایک ضروری اعلان ہے۔ اُسے سُن لیجئے۔ مرکزی وزارت میں بڑی اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ مختلف محکموں میں ردّ وبدل کے بعد اس بات کا بھی گمان ہے کہ مکھیہ منتری مرکزی وزارت میں ایک نئے وزیر کو شامل کریں گے۔ آج سات بجے مکھیہ منتری کی کوٹھی پر......"

لیکن اس سے آگے کسی نے شری گُدگُدا چاریہ کے اعلان کو نہ سُنا۔ تمام سابق وزیر اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مرکزی ہال کے دروازے کی طرف یلغار کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ ہر وزیر یہ چاہتا تھا کہ وہ سب سے پہلے ہال سے باہر نکل جائے، دھکم دھکا، دھینگا مشتی کا وہ عالم تھا کہ مچھلی مارکیٹ کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ کئی موٹے موٹے توندیل وزیر پاؤں تلے آکے روندے جاچکے تھے اور زمین پر پڑے چلا رہے۔ اور رحم کی التجا کر رہے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

دو تین بار شری گدگدا چاریہ نے چلا کے کہا۔ پھر یکایک انہیں بھی کچھ یاد آیا، اور وہ بھی ڈائس پر اپنی تقریر کا مسودہ پھینک کر ایک اتنی لمبی چھلانگ لگا کر، جو اس عمر کے آدمی کے لئے تقریباً ناممکن تھی، ہال کے دروازے پر پہونچ گئے، اور تیر کی طرح تمام وزیروں

کے بیچ میں سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا، وزیروں کے کلب میں سناٹا تھا۔ کرسیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ صوفے اوندھے تھے۔ دو تین وزیر فرش پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اور اسپتال کی ایمبولینس کا انتظار کر رہے تھے۔ اور کلب کے باہر سڑک پر وزیروں کا جم غفیر تھا، جو دونوں ہاتھ زور سے تھلاتے ہوئے وزیراعظم کی کوٹھی کی طرف دوڑ رہا تھا۔

لیجئے۔ ساگ والا گوشت بھی ختم ہو گیا۔ اور آپ کے عقب میں بیٹھا ہوا رگھورام رائے بھی کھانا کھا کے چلا گیا۔ خیر اس کی بات تو ختم ہی تھی۔ اور یہ کم بخت اس وقت یہاں ڈھابے میں آ گیا۔ تو مجھے اس کا واقعہ یاد آ گیا۔ ورنہ وہ واقعہ جو آپ کو میں سنانے والا تھا.....

وہ تو دوسرا ہی ہے۔ اور بہت اہم ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے۔ میں تپتی دوپہر میں اسی ڈھابے کی ٹین کے نیچے بیٹھا ہوا ——————

"آئیں! آپ کدھر چلے؟

ارے بل تو دیتے جائیے!؟"

اشوک کی موت

سارے محل میں سناٹا تھا۔ سات دن اور سات راتوں سے اشوک بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اُس کی ٹانگیں حرکت نہ کرتی تھیں۔ اس کا دھڑ حرکت نہ کرتا تھا۔ اس کے بازو ہل نہ سکتے تھے۔ صرف سانس کی حرکت باقی تھی۔ اور آنکھوں کی پُتلیاں روشن تھیں۔ اور زبان دھیرے دھیرے کام کرتی تھی۔ شہر کے سارے وئیدا اس کا علاج کر چکے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے، برما سے، چین سے، لنکا سے، سیام سے، ہند چینی سے بڑے بڑے دانش مند حکیم آئے تھے۔ غیر ملکوں کی حکمت اور اپنی زندگی کا سارا تجربہ اپنے ساتھ لائے تھے لیکن اشوک پر کسی دوا کا اثر نہ ہوا۔ بیماری بڑھتی گئی۔ اور وہ موت

کے گھاٹ اُتر تا گیا۔ آخر وہ وقت آیا، جب ہر ایک نے جواب دے دیا۔ جب دوا دارو والے، جنتر منتر والے، جھاڑ پھونک والے سب لوگ نا امید ہو گئے۔ اور ہر ایک نے کہہ دیا:

مہاراج ادھیراج اشوک اب بچ نہیں سکتے۔ اب ان کو جانا ہی ہوگا۔ اپنا محل، اپنا ملک، اپنا دھرم، اپنا فلسفہ، اپنا گیان، دھیان، اپنی پنچ شیلا، پتھر کے کتبے، مینار، لاٹ، فتوحات، شہرت، رعایا، بچے بالے ہر چیز کو یہیں چھوڑ کے جانا ہوگا۔ کوئی یاد بھی ساتھ نہ جائے گی۔ کیوں کہ جب دم نکل جاتا ہے تو اس جیون کی ہر یاد، اس زندگی کی ہر مسرت اور اس وقت کا ہر درد اور اس زمانے کی ہر ادا وہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور آدمی وہیں پر پہونچ جاتا ہے۔ جہاں سے وہ چلا تھا۔ صرف زمین ہی گول نہیں، صرف سورج ہی گول نہیں صرف نظامِ شمسی اور یہ کائنات اور یہ وقت کا بہاؤ ہی گول نہیں ہے انسان کی زندگی بھی گول ہے۔ ایک بہت بڑی گولائی کے اندر ایک نہایت چھوٹی سی، ذرے سے بھی مختصر گولائی۔ اشوک اعظم تھے۔ لیکن موت سے بڑا کوئی "اعظم" نہیں ہے۔"

یہ بات تو نہیں ہے کہ اشوک کو اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ بدھ کے پجاری تھے، اور موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن

نہ ڈرنے کی بات اور ہے۔ اور مرجانا دوسری بات ہے۔ اور ان دونوں باتوں میں بہت بعد ہے۔ اور اس بات کا پتہ زندگی میں نہیں چلتا، جب تک تنے میں رس رہتا ہے۔ پتے ہرے اور چکنے رہتے ہیں۔ شاخوں پر پھول اور کپل آتے ہیں۔ بلبل نغمہ سرا ہوتی ہے۔ پرندے گھونسلے بناتے ہیں۔ انسان سائے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں، اور درخت زندگی کی فتح اور اس کے غرور سے سرشار ہو کر آسمان سے آنکھیں ملا کر بات کرتا ہے۔ اس وقت اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سرشاری اور سرمستی کی کیفیت میں بھی اس کی ضد موجود ہے۔ اور یہ ضد تنے کی پور پور میں اور زندگی کی رگ رگ میں رچی رہتی ہے ہر عمل اپنے اختتام کو پہونچتا ہے۔

اشوک نے سوچا۔ انسانی تاریخ کے ہزاروں سال میں بہت ہی کم ایسے خوش قسمت انسان ہوں گے جو اپنی زندگی میں راجہ ہوتے ہوئے بھی دیوتا کی طرح پوجے گئے ہوں۔ وہ کون سی خواہش تھی میری جو پوری نہ ہوئی ہو۔ عزت، دولت، شہرت، محبت ہر اپسرا کے ساتھ میری زندگی نے بھرپور رقص کیا ہے۔ دھرم، نیک نامی، روح کا وہ گہرا گیان، جو بدھ کے عرفان نے مجھے دیا۔ جس کی جوت نہ صرف میں نے اپنے دل میں جگائی بلکہ چہار دانگ عالم میں پھیلائی۔ اس روشنی

اشوک کی موت

کو میں نے اپنی روح میں سمو کر جذب کر لیا۔ اس طرح کہ میرا ہر عمل میری روح کی آواز بن گیا۔ اور مجھے وہ مسرت اور خوشی اس دنیا میں ملی جس کی لوگ جنت میں توقع کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کیا چاہئے؟ پھر بھی یہ زندگی ہے کہ اپنی بقا کے لئے لڑے جاتی ہے۔ یہ دم ہے کہ بے دم ہوتے ہوتے بھی ختم ٹھونک کر قائم ہے۔ یہ جان نکلتی کیوں نہیں؟ یہ حرکت بند کیوں نہیں ہوتی؟ میری گردن کے حلقوں میں یہ اضطراب کیسا ہے؟ بدھ نے مجھے نروان کا سبق دیا۔ پھر بھی نروان حاصل کیوں نہیں ہوتا؟ سات دن اور سات راتوں سے میں اس بستر پر تڑپ رہا ہوں۔ ٹانگیں کام نہیں کرتیں، بازو کام نہیں کرتے۔ تنے کا رس سوکھ گیا۔ صرف آنکھوں میں روشنی اور زبان میں گویائی ذرا سی بس اس طرح باقی ہے۔ جس طرح جڑ سے اکھڑے ہوئے سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر آخری دو پتے ہرے رہ جاتے ہیں۔ اب ختم ہو جائے یہ زندگی۔ وہ رشتہ ٹوٹ جائے جو پتے کو شاخ سے باندھ کے رکھتا ہے۔ اور میری روح ایک کھڑکھڑاتے ہوئے پتے کی طرح فضا میں پرواز کر جائے!! میرا ہر احساس آسودہ ہو چکا۔ عرفان کا ہر گوشہ میری نگاہوں میں آ چکا۔ اب کیا باقی ہے۔ جس کے لئے یہ زندگی زندہ ہے۔ یہ آخری سانس سات دن سات راتوں سے کس

لیے حلق میں اٹکا ہوا ہے؟

ان سات دن اور سات راتوں میں اشوک کے دماغ نے اس امر پر بہت سوچا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور وہ جو سلطنت کے ہر کام، گیان دھیان کی ہر گتھی کو خود سلجھاتا تھا۔ موت اور زندگی کی آخری حد پر کھڑا ہوا ایک کرب ناک تذبذب سے دوچار رہا۔

اس نے اپنی پوری زندگی پر نگاہ ڈالی، چوکھٹے کی ہر کیل اپنی جگہ سلامت تھی۔ ہر چول اپنی جگہ ٹھکی ہوئی تھی۔ سلطنت کا ہر کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔

اشوک نے پھر ایک بار دہرایا....

"مہامنتری! کیا تم نے میری شدید علالت کا اعلان کر دیا ہے؟"

"ہاں مہاراج!"

"کیا جنتا جانتی ہے کہ اب مہاراج بچ نہ سکیں گے؟"

"ہاں مہاراج! مگر—"

"مگر کو جانے دو..... میں سمجھتا ہوں"

اشوک چپ ہو گئے۔ پھر بولے۔

"میرا بیٹا بندوسار کہاں ہے؟"

"حضور، وہ اپنے کمرے میں بیٹھے رو رہے ہیں"

"اگر وہ رو رہے ہیں، تو انہیں رونے دو۔ لیکن اگر شطرنج کھیل رہے ہوں تو انہیں میرے سامنے بلا لاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد راج کمار بندوسار ہاتھ جوڑ کر اپنے پتا کے سامنے کھڑے تھے۔

"مہامنتری تم نے میری پرجا میں اعلان کر دیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد مہاراج کمار بندوسار ہندوستان کے چکرورتی مہاراج ہوں گے؟"

"ہاں مہاراج۔ ہندوستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں منادی کر دی گئی ہے۔ باہر ملکوں میں سفیر بھیج دیئے گئے ہیں۔ جن راج کماروں سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ انہیں قید کر دیا گیا ہے۔"

"بندوسار تمہیں اس مہامنتری سے تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"نہیں پتاجی! ان کے گھر میں ایک بھی بالک نہیں ہے۔ یہ میری گدی چھین کر کیا کریں گے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اشوک چپ ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مہاپروہت کو بلا کے پوچھا:

"سب سامان تیار ہے؟"

اشوک کی موت

"ہاں مالک! کاشمیر سے زعفران آیا ہے۔ کیسری سے صندل کی لکڑی آئی ہے۔ مگدھ سے گھی آیا ہے۔ گاندھار سے پھل آئے ہیں، بنارس سے ریشم کا کفن آیا ہے۔ ہندو پروہت اور بدھ بھکشو بھگوان کے چرنوں میں آپ کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب۔ تو اب مجھے مر جانا چاہئے۔ لیکن پھر بھی میری جان کیوں نہیں نکلتی؟"

مہا پروہت نے کہا "آپ نہیں مریں گے۔ کلیان کاری بدھ کا آپ کو آشیرواد ہے۔"

اشوک نے سر ہلا کے کہا

"ہر آشیرواد کو ایک دن ختم ہونا ہے۔ ہر طرح کا گیان اور فلسفہ اور دھیان ایک دن اپنی موت کو پہونچتا ہے۔ اس سنسار میں ہر خیال کی موت ہے۔ ایک دن وہ بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اور کفن پہنا کر جلا دیئے جاتے ہیں!"

"لکھ لو۔ لکھ لو!!" مہا پروہت خوشی سے چلّایا۔
"مہا اشوک کی بانی!"

بھوج پتر پر ایک ادیب روتے ہوئے مہا پرش کی بانی لکھنے لگا۔
اشوک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ مر گئے ہوں۔ جسم ساکت، آنکھیں بند، ہونٹ بند، بازو اور ٹانگیں مُردوں کی طرح اکڑی ہوئی، پورے جسم پر موت کی سی زردی اور سیاہی۔

شاہی ویدوں نے آگے بڑھ کر نبض ٹٹولنا چاہی۔ سات دن اور سات راتوں سے وہ لوگ اسی کمرے میں جاگ رہے تھے۔ اور ایک پل نہ سوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں، اور زبان پر کانٹے سے محسوس ہوتے تھے، اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ واقعی دل سے دعا کر رہے تھے کہ اس جسدِ خاکی سے دیکھیں کب جان نکلے اور کب گھر جا کر گہری نیند سو جائیں اس کا بھی گمان تھا کہ اگر دو چار روز اور اشوک مہاراج اسی طرح زندہ اور مردہ رہے تو ان ویدوں میں سے کسی کا دم نکل جائے گا۔

ایک شاہی وید نے نبض کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اشوک نے دھیرے سے کہا "رہنے دو ابھی زندہ ہوں"

وید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اشوک نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔

"اب کیا وقت ہوگا؟"

سب سے بڑے وید نے کہا "سورج غروب ہو رہا ہے"

اشوک نے کہا: "مجھے جھیل پر لے چلو۔ شاید سورج کو جلتے دیکھ کر میرے دل میں بھی جانے کی خواہش اس شدت سے اُبھر آئے کہ میں اس جاں کنی کی حالت سے گذر کر گویا سورج کے ساتھ ہی دوسری دنیا میں چلا جاؤں۔"

اشوک کے جسم کو شاہی رتھ میں لٹا دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ گھوڑوں سے دُلکی چلا کر اُسے جھیل کے کنارے لے جایا گیا۔

یہ جھیل ایک خوب صورت پہاڑی وادی میں تھی۔ جھیل کے بیچوں بیچ اشوک کا راج محل تھا۔ چاروں طرف جھیل کا پانی تھا۔ اور صرف مشرق میں پہاڑ سے راج محل تک جھیل کو کشتیوں سے پاٹ کر راہ بنائی گئی تھی۔ سورج لال بھبوکا تھا۔ مغرب میں کانچ کی طرح شفق بادل سُرخ روشنی سے معمور جام شراب کی طرح چھلک رہے تھے۔ نور کا ایک سیلاب تھا کہ جھیل میں اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ محل کی بُرجیاں اور کلس سونے کے پانی سے جگمگاتے ہوئے......

کس قدر خوب صورت ہے یہ دنیا! اشوک نے ایک آہ بھر کے سوچا۔ اور اُسے یاد آیا کہ کبھی یہاں یہ محل نہ تھا کشتیوں کا پُل نہ تھا شہر نہ تھا۔ وہ خود اشوک آج کا اشوک نہ تھا۔ بائیس برس کا جوان شہزادہ تھا، جو شکار کی تلاش میں گھوڑے پر سوار دوڑتے دوڑتے

اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اِدھر آ نکلا تھا۔ اسی طرح شام کا وقت تھا سورج کے غروب ہونے میں یہی رعنائی تھی۔ صرف جہاں پر آج اس کا رتھ کھڑا ہے۔ وہاں پر ایک ماہی گیر کا جھونپڑا تھا۔ اور ایک لڑکی اپنے باپ کے ساتھ جھیل میں سے جال کھینچ رہی تھی، اور اس کا سارا بدن ایک سنہری کمان کی طرح جھیل کے پانیوں پر کھنچا ہوا یوں ڈول رہا تھا جیسے کنول کا پھول لہروں کے ہلکورے کھاتے ہوئے سطح آب پر رقص کرتا ہے۔

وہ رقص آج کہاں ہے؟ وہ مچھلی کدھر گئی؟ کس تحصیل میں؟ کس تالاب میں یا کانچ کے کس پیالے میں رقص کر رہی ہے؟

اشوک نے آہ بھر کے کہا۔

"مجھے واپس لے چلو۔ یہاں آ کے تو میں جوان ہوا جاتا ہوں!"

آدھی رات اور گذر گئی۔

محل کی غلام گردشوں میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ اشوک کا کمرہ اگر اور لوبان سے مہکا ہوا تھا۔ دھیمے دھیمے سُروں میں بھکشو پاٹھ کر رہے تھے۔ اشوک کے سر کے پاس ایک بڑی کھڑکی کھلی ہوئی تھی کھڑکی کے آر پار سنکیسر کے پیڑ کی ایک شاخ لال لال پھولوں کی وینی سے سجائے کھڑی تھی۔ اس وینی کے پرے کھلے آسمان میں تارے گویا آنکھیں

جھپک رہے تھے۔

کتنی خاموشی ہے۔ کتنا پیارا سناٹا ہے۔ اشوک نے سوچا۔ اس شہر بھری غنودگی میں اگر کہیں سے ایک دھیما دھیما رقص شروع ہو۔ اور میری زندگی اسی رقص کی تال پر چکر کھاتے ہوئے دھیمے دھیمے یوں غائب ہو جائے، جیسے آسمان کی پہنائی میں اپسرائیں رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں، تو کتنا اچھا ہو۔

اشوک نے حکم دیا، اور رقص شروع ہو گیا۔

رقاصائیں بھی نیند سے جاگی تھیں، اس لئے اُن کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اور اس طرح کا تھا جیسے ہر رقاصہ کا بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اور لوٹ کر انگڑائی میں فتنہ بن رہا ہو۔ تال میں ان خوابیدہ جذبوں کی مہک تھی جو جوان رات کی بستر پر جاگتے ہیں۔ ان رقاصاؤں کے ہر خم میں کس قدر خطرناک بلاوا ہے۔ ہر آرزو سیراب ہو چکی، ہر ہوس آسودہ ہو چکی۔ اب جسم و جاں میں عالم نشاط کی کوئی کیفیت باقی نہیں۔ پھر بھی نگاہ کیسے رُک جاتی ہے۔ عورت کے ہر خم میں کیسے الجھ کر رہ جاتی ہے۔ گیسوئے مشکبار گویا اپنی کالی آنکھوں سے میری طرف جھانکتے ہیں۔ اور اجنبی عطر کا پیام دیتے ہیں۔ اب بھی، آج بھی، زندگی کے آخری دروازے پر بھی، زندگی عورت کے فریب میں مجھے

بلاتی ہے؟

اشوک نے آہ بھری ——

"ایسے تو میں کبھی نہ مر سکوں گا!"

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے رقص روک دیا۔

لَے، تال، سُر ہاتھ کی ایک حرکت سے بکھر گئے۔ ٹوٹ گئے خاموش ہو گئے، رقاصاؤں کی میٹھی میٹھی چھاجھروں کی صدا —— غلام گردشوں میں گونج گونج کر دب گئی۔ اور پھر محل میں سناٹا چھا گیا۔

باقی رات اشوک نے انتہائی کرب میں گزاری۔ اور جاں کنی کے گہرے درد سے بے تاب ہو کر اس نے بار بار بھگوان بدھ سے التجا کی کہ وہ اسے نروان کا راستہ دکھائیں۔

اشوک نے ویدوں کے اصرار کے باوجود ہر قسم کی دوا پینے سے انکار کر دیا تھا۔ بے بس وید، منتری اور کرمچاری محل کی رانیاں اور عورتیں، شہزادے اور جاگیردار ہاتھ باندھے محل کے اندر اور محل کے باہر زندگی اور موت کے اس معرکے کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ رعایا اپنے اپنے گھروں میں خوف و ہراس سے دبکی پڑی تھی۔ ان کے کان شاہی محل کے گھنٹے کی طرف تھے۔ جو اشوک کی موت

کے اعلان کو سارے شہر میں پھیلا دے گا۔

لیکن ساری رات گذر گئی - اور اشوک نہ مرا۔ اس کا بے کار، بے آسرا جسم موت اور زندگی کے تھپیڑوں میں ایک شکستہ کشتی کی طرح ڈولتا رہا۔ نہ وہ ڈوبا نہ کنارے پر لگا۔ روح بار بار جسم سے ہجرت کر کے نکلنے کی کوشش کرتی۔ لیکن جانے وہ کیا چیز تھی، جو اسے ابھی تک اس ناکارہ جسم سے باندھے ہوئے تھی۔ بس صرف ایک تار تھا، ایک سانس تھا، ایک دھاگا تھا۔ دل کی ایک ہی دھڑکن تھی جو زندگی کو جسم سے الگ نہ ہونے دیتی تھی!

جب صبح ہونے والی تھی، تو اشوک نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اس نے اپنے جسم وجاں میں ایک عجیب سی تازگی محسوس کی۔ سات دنوں اور سات راتوں کے بعد آٹھویں صبح کو پہلی بار اس کے نیلے ہونٹوں پر دوج کے چاند کی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے حکم دیا کہ اس کا بستر باہر باغ میں سیب کے درخت کے نیچے سجایا جائے۔ وہ اپنی آنکھوں سے صبح ہوتی دیکھے گا۔ رات کو جاتے اور دن کو آتے دیکھے گا۔ شاید اس آنے اور جانے کے دوران میں اس کی روح کو اس کشمکش حیات سے نجات مل جائے! غلاموں نے اسی وقت اس کے حکم کی تعمیل کی۔

ابھی صبح آئی نہ تھی، جب اشوک کا بستر شاہی محل کے بائیں باغ میں سیب کے پیڑ کے نیچے لگا دیا گیا۔ ابھی رات کا اندھیارا باقی تھا۔ ابھی پرندے بولے نہ تھے، چڑیاں چہچہائی نہ تھیں، کوّوں نے پَر پھڑپھڑائے نہ تھے۔ کلیوں نے آنکھ کھولی نہ تھی۔ عاشق نے اپنے محبوب کا سر اپنے کندھے سے اٹھایا نہ تھا۔ اس نیم اندھیارے میں اشوک سیب کے نیم تاریک سایوں میں پڑا پڑا موت کو آواز دینے لگا:

اے رات! اے لطیف موت کے سبک سائے، مجھے اپنے ساتھ لے جا۔ اب یہ جاں کنی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اے زمین سے اٹھ کر آسمان کی طرف بھاگنے والے سائے مجھے اپنے مہکتے ہوئے دامن میں چھپا لے۔ میری تھکی ہوئی ناآسودہ روح کو کسی نئے افق کی آسودگی بخش، کسی اور ترتیب میں، کسی اور صورت میں، کسی اور تجسیم اور تشکیل کے زاویوں میں مجھے ڈھال دے۔ مگر مجھے یہاں سے نکال لے جا۔ اس آخری سانس کو میرے جسدِ خاکی سے یوں کھینچ لے: جیسے مشاق شکاری اپنے پاؤں سے کانٹا کھینچ لیتا ہے۔ پھر مجھے قرار آجائے گا۔ پھر مجھے نیند آجائے گی۔"

بہت دیر تک اشوک اسی طرح اپنے ہونٹوں میں بڑبڑاتا رہا۔ دیر تک محل کے مؤدب کارندے اس سے دور ہٹ کر نگاہیں نیچی کئے

ہاتھ باندھے اسے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ ہولے ہولے رات کی سیاہی ادپیا اٹھتی گئی۔ سیاہی کے دبیتے سمٹتے گئے۔ سمٹ کر صورتیں اختیار کرتے گئے۔ صورتوں میں چمک آنے لگی۔ چمک سے حرکت پیدا ہو گئی۔ کہیں پر کوئی کلی چٹکی۔ پتوں کا جھومر ہوا میں لہکا۔ اور چشم زدن میں سیب کا سیاہ پیڑ سفید سفید پھولوں سے بھرا ہوا نظر آیا۔ فضا میں پرندوں کی چہکاریں سُبک خرام بطوں کی طرح تیرنے لگیں اور افق تا افق زمین اور آسمان روشنی سے منور ہو گئے!

عین اسی لمحے باغ کے ایک کونے سے ایک زور کی چیخ سنائی دی، اور پھر کوئی بلبلا کر زور زور سے رونے لگا۔

اشوک نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

خدام نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"مالی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے۔"

"بچہ ہوا ہے؟ ——— اسے میرے پاس لاؤ۔"

وہ سہمی، بلکتی، ہمہاتی ننھی سی جان جب اشوک کے سینے پر رکھ دی گئی تو ایک عجیب سی مسکراہٹ سے اشوک کا چہرہ منور ہو گیا۔ مالی کا ننھا اشوک کے سینے پر چڑھ کر اپنے چاروں ہاتھ پاؤں

ایک بارگی چلاتے ہوئے حرکت کر رہا تھا ۔ اور اشوک کے سینے میں دودھ مشغول رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کا منہ کھلا تھا اور وہ مضبوطی سے روتے ہوئے اپنے پیٹ کے لئے دودھ اور اپنی زندگی کا حق مانگ رہا تھا ——!

اشوک نے دھیرے سے کہا ——

"ٹھیک تو ہے ۔ اب میں سمجھا ۔ کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے ۔ کسی کے آنے کی امید نہ ہو تو کوئی جائے کیوں ؟ اور اگر کوئی جائے گا ہی نہیں تو کوئی کیسے آسکے گا ۔ یہ دنیا اگر ایک ایسی سرائے ہوتی جس میں جانے کا کوئی دروازہ نہ ہوتا ، صرف آنے ہی کا دروازہ ہوتا تو پھر ایک دن وہ آتا جب اس میں کوئی نہ آسکتا ۔ اس لئے اب جانا ہی چاہیے ۔ پھل جب پک جاتا ہے تو شاخ سے ٹپک پڑتا ہے ۔ اگر پھل ٹپکے گا نہیں تو دوسری بہار میں اس شاخ پر نئی کونپل کہاں سے آئے گی ، اور کونپل پھر نیا پھول کہاں سے پیدا کرے گی ؟ "

اشوک نے پیار بھری نگاہوں سے ننھے بچے کو دیکھا —— ان نگاہوں میں اب کسی طرح کی حسرت نہ تھی ۔ کسی طرح کا ملال نہ تھا ۔ کسی طرح کی مایوسی نہ تھی ۔

اشوک نے آنکھیں پھیر کر سیب کے پیڑ کی طرف دیکھا ، اور

دُور اوپر ـــ دُور اوپر اُس کی آنکھوں میں پھول ہی پھول کھلتے گئے احساس کے رونئیں رونئیں میں ایک اجنبی موسیقی کے بلاوے گونجنے لگے ۔ اور محراب در محراب افق کے نئے دروازے اور دریچے اس کی روح کے لئے کھلتے گئے ۔ یکایک اس نے پیر پھیلائے اور سیب کے درخت سے بہت اوپر فضا میں اڑ گیا ـــ !

اوم منی پدمنی ہوم

دیوار گیر گھنٹے بجنے لگے ۔ کلسوں، برجوں، میناروں سے صدائیں بلند ہوئیں ۔

"مہاراج اشوک مر گئے!

مہاراج اشوک مر گئے!!"

مالن نے دوڑ کر اپنے بچے کو اشوک کے سینے سے اُٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا !

پچھوا

وہ آیا۔ اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے اسے دیکھ کر انتہائی کراہت محسوس ہوئی۔ میلی چیکیٹ قمیص، گندی تار تار پتلون، جگہ جگہ مٹی کے دھبے، جیسے وہ عرصے سے اس پتلون میں زمین پر سوتا رہا ہے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور رخسار اندر کو پچک سے گئے تھے اور آنکھوں میں ایک غیر معمولی غیر صحت مند جھلک تھی، جیسے وہ آنکھیں ہانپ رہی ہوں۔ جیسے ایک جنگل ہو۔ چاروں طرف بھیڑیئے ہوں، اور بیچ میں ایک ہرن ہو۔

مگر ہرن تو بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ مگر اس آدمی پر خوبصورتی نرمی، ملائمت نام کو نہ تھی۔

اُس کی سُوکھی، دبلی پتلی گردن پر میل کی اتنی پُرانی تہیں جمی تھیں کہ اُنہیں کھرچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ممکن ہے میل سے جلد کو کھا لیا ہو جیسے زنگ لوہے کو کھا ڈالتا ہے۔ آپ نے میل کو ناخن سے ذرا سا کھرچا اور اندر سے جلد کے بجائے خون نکل آیا۔ کچھ ایسا احساس مجھے اس کی گردن، چہرے اور بانہوں پر میل کی تہوں کو دیکھ کر ہوا، اور میں ذرا سکڑ کر بس کی کھڑکی سے جا لگا۔

کیا ہرج تھا، اگر وہ لیموں رنگ ٹافیٹا کا فراک پہنے ہوئے خوب صورت لڑکی میرے پاس بیٹھ جاتی۔ یا وہ تائی لان کی ساڑھی سے چھن کر نظر آنے والی عورت ــــ جیسے چھنتی ہوئی بدلی میں ماہتاب ـــ؟ اس سے تو آنکھوں میں سا کاجل اور بالوں میں وینی اور دماغ میں چابیوں کا گچھا چھپائے ہوئے وہ گجراتی لڑکی ہی بہتر تھی، جسے میں نے کسی بہتر حسن کی تلاش میں اپنے دل ہی دل میں رد کر دیا تھا۔

یکایک داڑھی بڑھائے ہوئے دبلا پتلا آدمی زور سے کھانسا۔ اور چونکہ میں کھڑکی کی طرف تھا، بلکہ کھڑکی میری طرف تھی۔ اس لئے وہ کھڑکی سے باہر تھوکنے کے لئے میری جانب جھکا، اور تھوک کر جب واپس لوٹا، اور مجھے اس کے جسم پر سے کہیں سے کپڑے کے چرانے کی آواز آئی اور پھر مڑ کر جب میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ جہاں

جہاں اُس کا کپڑا میرے بدن کے کپڑوں سے چُھو گیا تھا، غلاظت کی دھاریاں بناتا چلا گیا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میری قمیص سپید براق تھی اور اب دھاری دار۔ ایک لمحہ پہلے میری پتلون کریم رنگ اور امریکی شارک اسکن کی تھی اور اب بھورے کھدر کی۔

ایک غریب آدمی ساری بس کو کیسے گندہ کرتا ہے، اس کا اندازہ مجھے آج ہی ہوا۔ آخر یہ گورنمنٹ غریب آدمیوں کے لیے الگ بسیں کیوں نہیں چلواتی؟ کس لئے ہم سے یہ انکم ٹیکس لیتی ہے؟

میں نے ذرا گھور کر اس مفلس آدمی کی طرف دیکھا۔

اس نے جواب میں اور بھی زیادہ گھور کر میری طرف دیکھا، اور اس کی آنکھوں کی خشمگیں چمک اور ابھر آئی۔ اور پتلی گردن کا حلقوم اوپر نیچے حرکت کرنے لگا۔

اتنے میں بس کنڈکٹر قریب آیا۔ دُبلے پتلے چمرخ نے اپنی پتلون کی جیب سے ٹٹول ٹٹول کر ایک اکنی نکالی، اور اندھیری کا ٹکٹ لے لیا

یہ اندھیرا اندھیری تک میرے ساتھ رہے گا؟ کم بخت! اسے میری سیٹ ہی پر بیٹھنا تھا؟ کتنی خوب صورت بس ہے۔ جٹ کے سے نازک خطوط اور اس طرح سبک رفتار، سینر سیٹیں اور نیلے رنگ کی دیواریں اور سپید روشنی کی ٹیوبیں، جت سے ٹافیٹا کا بھورا رنگ اور نائی لالن

کا شفاف پن اور لپ اسٹک کا گہرا سرخ رنگ چمک اٹھتا ہے۔ اس بس میں ایسا آدمی میرے پاس بیٹھا ہے! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے فٹ پاتھ سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر کے میری سیٹ پر ڈال دیا ہو! انتہائی بدمذاقی ہے یہ۔ تھو ــــ!

میری مصیبت یہ ہے کہ میں ایک خوش ذوق آدمی ہوں ــــ میں گاڑیوں میں کیڈی لیک کو، کپڑوں میں شارک اسکن کو۔ اور ادب میں دوامی قدروں کو بہت پسند کرتا ہوں ــــ مگر یہ زندگی۔ یہ دنیا ایسی ہے کہ اکثر میرے جذبات مجروح کرتی رہتی ہے۔

اب کیا کیا جائے؟

میں نے اپنی گود میں لیٹی ہوئی کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور اس کے صفحات میں پناہ چاہی۔ یہ ایک خوبصورت فرانسیسی ناول تھا جس میں ایک بیٹی اپنے باپ کی محبوبہ سے رقابت محسوس کرتی ہے اور ایسے اقدامات کرتی ہے جس سے اس کے باپ کی محبوبہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ Bonjoun trietsee یعنی کس قدر زندگی کی ابدی قدروں سے بھرپور ناول تھا یہ!

ابھی میں اس کے دو ایک صفحے ہی پڑھ سکا تھا کہ اگلے اسٹاپ سے مسافروں کا ایک ریلا اندر آیا اور بس اس کونے سے اُس کونے تک کھڑے

ہوئے زور زور سے باتیں کرنے والے مسافروں سے بھر گئی۔ میں نے گھبرا کر کتاب بند کر دی۔ یہ لوگ پڑھنے بھی نہ دیں گے۔ اب تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا کہ چلو زندگی کی چلتی پھرتی عارضی قدروں ہی سے جی بہلا لیا جائے۔

بے چارہ بس کنڈکٹر جلدی جلدی اپنے مسافروں کو بھگتنے میں مصروف تھا۔ پیسے لے رہا تھا، ٹکٹ کاٹ رہا تھا، اور پیسے دے رہا تھا، اور چھوٹے چھوٹے بس اسٹاپ پر غصے اور تیزی سے "جگہ نہیں ہے" کی گھنٹی بجانے میں مصروف تھا۔

اُس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ سہارن پور یا میرٹھ کے علاقے کا ہے۔ اُس کے سر کی ٹوپی ایک طرف کو کھسک گئی تھی۔ اور چُٹیا سر کے پیچھے چپکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خاکی کوٹ کے دو بٹن ندارد تھے، اور پتلون اُس نے اِس طرح پہن رکھی تھی جیسے سارنگی نے غلاف پہن رکھا ہو، مگر اُسے دیکھ کر بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔ ہنسی کے لئے بھی ایک خاص طرح کی لطافت چاہیئے۔

اُسے دیکھ کر بس ایک عجیب طرح کی مایوسی اور بدحواسی کا خیال آتا تھا۔ خیال آتا تھا کسی کھوئے ہوئے جانور کا، کسی بکھرے ہوئے شکار کا، کسی سوکھے ہوئے درخت کا، کسی ناموزوں مصرعے کا۔ خیال آتا تھا پت جھڑ

میں اڑاڑ کر گرتے ہوئے اُداس پتوں کا، جاڑے کی کثیف رنجور بدلیوں کا، اُن بے کس جانوروں کا جو موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ مانگ کر کسی پتلے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے ہانپتے کھڑے رہ جاتے ہیں، یہ بس کنڈکٹر بھی اس وقت اسی طرح ہانپ رہا تھا۔ پسینہ اس کے ماتھے سے گر رہا تھا۔

ہمارے پیچھے کی سیٹ پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ایک ایک نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا، اور دو ٹکٹ مانگے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے دو ٹکٹ کاٹ کے ان کے حوالے کئے، اور جب اس لڑکے نے باقی پیسے مانگے تو کہا، ابھی دیتا ہوں، اور جلدی سے ان دو آدمیوں کے ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہوگیا، جو اگلے اسٹاپ پر دروازے سے باہر چلنے والے تھے۔ اچھا ہوا اُس نے انہیں روک کر دو ٹکٹ دے دیئے۔ ورنہ وہ تو مفت کی سواری کر گئے تھے۔

وہاں سے بیچارہ بس کنڈکٹر جو لوٹا تو اسے ایک موٹے مستدھی نے گھیر لیا: اور اسے دو روپئے دیئے اور دو آنے کا ٹکٹ مانگا۔ اتنے میں اگلا اسٹاپ آگیا۔ اور بس کنڈکٹر جلدی سے سب کام چھوڑ کر بس کے دروازے پر لپکا کہ لوگوں کو اندر آنے سے روکے۔ کیوں کہ بس بھر چکی تھی۔ یہاں پھر دو آدمی اُتر گئے، اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک بچے کو انگلی سے لگائے

اندر داخل ہوئی۔

عورت چونکہ بھدی، موٹی اور بدصورت تھی، اس لئے بس میں کوئی مرد اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے سیٹ دینے کے لئے تیار نہ ہوا، اور نہ کسی نے اس کے بدصورت بچے ہی سے پیار کیا۔

اگر اس کی جگہ کوئی خوب صورت عورت ہوتی، یعنی زندگی کی دوامی قدر ہوتی، تو چار چھ لوگ اس کے اندر آتے ہی اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کر دیتے۔

پھر وہ ایک جگہ بیٹھ جاتی تو کوئی اُس کے بچے کو اپنی گود میں لے لیتا

"ارے کس قدر پیارا بچہ ہے!"

اُسے چومتا چاٹتا، اور اس طرح کا پیار ظاہر کرتا جیسے دراصل وہی اس کے بچے کا باپ ہے۔ کئی لوگ تو اس موقعے پر بچے کو گود میں لئے وہیں اتر جاتے ہیں جہاں اس خوب صورت عورت کو اترنا ہوتا ہے۔ اور باتیں کرتے ہوئے بچے اور اس کی ماں کو گھر تک پہونچا کے آتے ہیں، اور اگلے دن کی دعوت قبول کر کے آتے ہیں۔

مگر یہاں تو کچھ نہ ہوا۔

بدصورت عورت اور بدصورت بچہ، دونوں بھیڑ میں کھڑے رہے، اور دوسرے مسافروں کے دھکے کھاتے رہے۔ بس کنڈکٹر نے لوٹ کر

موٹے سندھی کو ایک روپیہ چودہ آنے دیئے۔ اس بدصورت عورت اور اس کے بچے کا ٹکٹ کاٹا۔ پھر اسے یکایک خیال آیا کہ اسے کسی اور آدمی نے بھی ایک روپیہ دیا تھا، اور اس میں سے تیرہ آنے واپس کرنے ہیں، چنانچہ اس نے اس چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سوکھے پتلے چمرخ آدمی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک لمحے کے لئے چمرخ آدمی کی آنکھوں میں حیرت جھلکی، پھر غائب ہوگئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھ نے زور سے ان تیرہ آنوں کو اپنی مٹھی میں چھپا لیا۔ اب مٹھی اس کی پتلون کی جیب میں چلی گئی تھی اور وہ تن کر سیدھا ہوگیا، اور اپنے بالکل سامنے دیکھنے لگا، جیسے اسے اس پورے واقعے سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پچھلی سیٹ کے دونوں نوجوان لیموں رنگ ٹافیٹا کے فراک کو تحریفی نگاہوں سے تک رہے تھے، کب سے تک رہے تھے! کیسی خوب صورتی تھی اُن کی آنکھوں میں! کتنے ہی پھول کھلے تھے۔ کتنی ہی بہاریں آئی تھیں۔ کتنے ہی آبشار گائے تھے۔ آرزوؤں کے کتنے ہی سمندر، خوشبوؤں کے کتنے ہی کھیت، خوابوں کے کتنے ہی سنہرے جال اُن آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ یہ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، سنتی ہیں، بولتی ہیں، اور انسانوں کے دل کی طرح دھڑکتی ہیں۔ ان چاہنے والی آنکھوں

کی خوب صورتی کا جواب کس حُسن کی رعنائی میں ہے ؟ــــ ان دونوں نوجوانوں نے اپنے بیترہ آنوں کو کسی دوسرے کی جیب میں جاتے ہوئے نہ دیکھا۔ کیوں کہ اس وقت ان کی آنکھیں وہ دیکھ رہی تھیں جو بیترہ آنے کبھی نہیں دیکھ سکتے ــــ روپیہ بہت بڑی چیز ہے لیکن وہ انسان کی آنکھ تو نہیں ہے۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحہ کے حسن نے کیا۔ دوسرے لمحے وہ لیموں رنگ ٹافیٹا فراک والی عورت اپنی سیٹ سے اٹھی اور خراماں خراماں دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس کے ریشم کی سرسراہٹ اک اُداس خوشبو کی طرح بس میں بکھر گئی۔ اک شفق سی چاروں طرف کھل اٹھی۔ دوسرے لمحے میں سورج ڈوب گیا، اور بس میں تاریکی چھا گئی ــــ کم از کم ان دونوں نوجوانوں کو ایسا ہی محسوس ہوا۔ ان نگاہوں میں رات چھا گئی۔ چند لمحوں کے لئے.....

لیکن جب رات آئی تو یاد آئی، اور جس نوجوان نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا تھا، اسے اپنے بیترہ آنے یاد آئے، جو اسے بس کنڈکٹر سے وصول کرنے تھے......

یُوں ہی ہوتا ہے ــــ اس زندگی میں یوں ہی ہوتا ہے۔ جب خوب صورتی چلی جاتی ہے تو روپیہ یاد آتا ہے۔ جب محبت چلی جاتی ہے

تو انتقام یاد آتا ہے۔ جب شباب گذر جاتا ہے تو اخلاق سر اُٹھانے لگتا ہے۔ جب زندگی سے اچھی چیزیں نکل جائیں تو صرف کینہ حرکتیں باقی رہ جاتی ہیں!

اے میری پیاری لیمن ٹافیٹا، تو کیوں اِس بس سے باہر چلی گئی؟ اگر تو نہ جاتی، تو پھر وہ نہ ہوتا جو اَب ہُوا، جو پہلے بھی ہوا تھا، جو آگے بھی ہوگا۔ تو کیوں نہ اس بس میں آ کے بس گئی؟ تو نے کیوں نہ اس سے دوامی پیار کر لیا؟ اے میرے اَبدی حسن! تو کیوں ایک لمحے کی طرح آیا، اور ایک چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا؟

ارے میاں افسانہ نویس، یہ کیا بکواس ہے؟ میں تمہاری پیاری لیمن ٹافیٹا کو اچھی طرح جانتا ہوں' یہ جو لیمن ٹافیٹا ہے، اصل میں اس کا نام جوزیفائن ککر بیٹا ہے۔ یہ باندرے کی رہنے والی ہے۔ اس کا باپ غیر قانونی طور پر شراب بیچتا ہے۔ دو مرتبہ یہ جیل جا چکی ہے۔ ایک مرتبہ بچہ نکلوا چکی ہے۔ دس تو اس کے عاشق ہیں۔ یا پولر ڈانسنگ ہال میں ناچ سکھاتی ہے۔ اور امیر سیٹھوں کے بے وقوف بیٹوں کو اپنے جال میں

پھنسائی ہے۔ ہر وقت پیٹے رہتی ہے۔ کچی پیاز کھانے کا اسے اس قدر شوق ہے اور تم اس کی خوشبوئیں بس میں بکھیر رہے ہو! یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ارے کچھ تو سچ بولو۔ میاں!

ارے ارے رے تو کہاں سے آمرا۔ کم بخت! میرے "چلتے ہوئے افسانے میں بریک لگا دی۔ اُتر جا میرے بھائی، اپنے افسانے کی بس سے اُتر جا۔ میں اگر سچ بولوں گا تو ایڈی قدروں والا افسانہ کیسے لکھا جائے گا وہ خوب صورت دھندلا دھندلا پن جیسے کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے' کچھ سمجھ میں آتا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں بھی آتا ہے۔ بلکہ اگر بالکل ہی نہیں آتا ہے تو بہت ہی اچھا ہے۔ پھر میں وہ سب کہاں سے لاؤں گا۔؟ اُتر جا میرے پیارے' میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے پڑھنے والوں کو ڈھرے پر لگایا تھا: تو نے آ کے سب گڑبڑگھٹالا کر دیا کم بخت ...... گیٹ آؤٹ!

پیچھے کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے جس کا نام موتی تھا اپنی جیبیں ٹٹولیں، اور پھر اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"گلشن، تم نے باقی پیسے کنڈکٹر سے لئے ؟"

اب کے گلشن نے اپنی جیبیں ٹٹول کر کہا ——

"نہیں !"

"اچھی طرح سے یاد ہے ؟"

"اس میں یاد کرنے کی کیا بات ہے۔ ہم دونوں اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔"

"اچھے موقعے پر یاد آیا، ورنہ روپیہ گُل تھا اے مسٹر کنڈکٹر..... !"

مگر اس موقع پر پانچ چھ کنڈکٹر جو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہے تھے۔ سانتا کروز کے اڈے سے بس میں سوار ہو گئے، اور ان سب لوگوں میں باتیں ہونے لگیں۔

سہارن پوریا کنڈکٹر بے حد پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی، جیسا کہ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا۔ اور تین چار روز سے وہ ایک دن کی چھٹی مانگ رہا تھا۔ مگر اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے جو دوا تجویز کی تھی۔ اس دوا کے پیسے بھی اس کے پاس نہ تھے۔ بھلا سات روپے کی دوا میں کہاں سے لاؤں گا؟ سو روپیہ تو صرف اپنی لیکا رہے سو روپیوں میں بھی ہوتا کیا ہے ! اس کے بعد اس نے سو روپے کا بجٹ گن کر سنایا۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے، اور اس کی جیب بھی آخری لمحوں پر تھی۔ غریب

چوہا

آدمی کی جیب ہر مہینے مرتی ہے۔ زندگی میں ایک دو بار مرنا تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہر ماہ مرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ زندگی سے مذاق معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ جو سو روپیہ پانے والے تو تھے ہی۔ اور ان کی اپنی بڑی مضبوط یونین تھی، جو بہت سی باتیں منوا بھی لیتے تھے، یہ لوگ بھی اتنے قدر پریشان تھے۔

سہارن پور ریسٹ کنڈکٹر نے بات کیا چھیڑی، گویا کنڈکٹروں کا چھتہ چھیڑ دیا۔ سبھی کنڈکٹر الجھ پڑے۔ اور کمپنی کو گالی دینے لگے۔ زندگی سے، ماحول سے، منیجر سے، تم سے، مجھ سے، شکایت کرنے لگے۔

'کیسے ناشکرے لوگ ہیں یہ؟' میں نے انہیں دیکھ کر سوچا: 'انہیں کمپنی سے باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے، مہنگائی کا الاؤنس ملتا ہے، چھٹی ملتی ہے، اور کیا چاہئے انہیں؟ موت؟؟ — ان مزدور لوگوں سے آپ جتنا اچھا سلوک کرتے جائیں، یہ اتنا ہی آپ کے سر چڑھتے جائیں گے۔ اونہہ کمینے کہیں کے!

وہ سہارن پور والا کنڈکٹر کہنے لگا: "سچ جانو، جیب میں صرف ایک روپیہ پانچ آنے ہیں۔ اب تم بتاؤ ایک روپیہ پانچ آنے میں سات روپے کا انجکشن کیسے آسکتے ہیں؟ — اور ماں کی زندگی کا سوال ہے!" کنڈکٹر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے —

"اے مسٹر کنڈکٹر!" ـــــ موتی اپنی سیٹ سے پھر زور سے چلّایا "ذرا ادھر آنا بھائی"

"کیا ہے؟"

"تم کو ایک روپیہ دیا تھا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ تم نے ہم کو دیا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ (گلشن کی طرف اشارہ کر کے) اس کو دیا۔ باقی تیرہ آنے لاؤ ــــ!"

"تیرہ آنے تم کو نہیں دیئے؟" کنڈکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں ــــ اُس وقت رش بہت تھا۔ تم نے کہا: ابھی دیتا ہوں۔ اب تک تو دیئے نہیں۔ تین چار اسٹاپ گزر گئے۔ اب لاؤ!"

یکایک بس کنڈکٹر کو کچھ یاد آیا۔ مگر اسے یہ یاد نہ آیا کہ اس نے کسے پیسے دیئے ہیں۔ وہ بولا "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں نے تمہیں پیسے دیئے ہیں۔

اتنا کہہ کر اس نے گلشن کی طرف اشارہ کیا۔

گلشن نے سر ہلا کے کہا "تم نے مجھے پیسے نہیں دیئے"۔

"تو پھر میں نے تمہارے دوست کو دیئے ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے"

"تم نے مجھے بھی پیسے نہیں دیئے" موتی نے غصے سے چلّا کر کہا۔

دو ایک اور بس کنڈکٹر آ گئے، بولے: "صاحب' اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ اپنی جیب تو دیکھئے"!
یہ سُننا تھا کہ موتی اور گلشن دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے اپنی پتلون کی جیبیں باہر نکال دیں ——
جیبیں بالکل خالی تھیں۔
گلشن نے ذرا اداس لہجے میں کہا ——
"ہم لوگوں نے نوبہار اسٹوڈیو تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ ہماری جیب میں صرف یہی ایک روپیہ تھا"!
یہ کہہ کر دونوں بیٹھ گئے —— محجوب اور شرمندہ —— جیسے بھری محفل میں کسی نے ان کی بے عزتی کی ہو —— کیوں ان کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔
وہ دونوں نوجوان تھے۔ اور چال ڈھال سے فلمی ایکسٹرا معلوم ہوتے تھے۔ گردونوں کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ دونوں تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے —— مگر بے کار۔ ان کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا —— ایک سو ہوتا —— ایک ہزار ہوتا —— ایک لاکھ ہوتا، تو کیا وہ اس طرح اپنے روپیہ کا مطالبہ کرتے؟
مگر اب وہ مجبور تھے۔ ایک ہی روپیہ تھا۔ اور رات کو نوبہار اسٹوڈیو

میں شوٹنگ تھی۔ اس ایک روپے میں دو آدمیوں کی چائے پانا یا سگرٹ کھانا، اور واپسی میں بس کا کرایہ ——— ایک ایک پائی زنجیر میں بندھی تھی، اِدھر سے اُدھر نہ جا سکتی تھی ——— یہ تیرہ آنے تو انہیں ملنا ہی چاہئیں۔

"مگر میں تیرہ آنے دے چکا ہوں" بس کنڈکٹر نے، جس کی ماں بیمار تھی، تقریباً روہانسا ہوکر کہا۔

"کس کو دیئے تم نے؟" گلشن نے ذرا غصے سے کہا۔

بس کنڈکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر موٹے سیٹھ جی پر پڑی اسے کچھ یاد آیا ——

"شاید غلطی میں آپ کو دے گیا"

"غلطی ہی نہیں، تم نے ٹھیک دیئے۔ میں نے یہ ٹکٹ دو آنے کا خریدا ہے۔ میں نے دو روپیہ دیا۔ تم نے ایک روپیہ چودہ آنے واپس کیا اب مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے سائیں؟"

بس کنڈکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کس سے کیا کہے:

میں غور سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پتلون میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ اِدھر دیکھ رہا تھا نہ اُدھر —— جیسے اُسے اس پورے واقعے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اس کے زرد رخسار

اور زرد ہو گئے تھے۔ اور ان کی کھال اور کھنچ گئی تھی۔ اس کی سانس تیزی سے آتی باقی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اس قدر بھوکی گرسنہ اور خشمگیں معلوم ہوتی تھی، گویا کہہ رہی تھی۔ یہ تیرہ آنے جو میری مٹھی میں ہیں، میری زندگی ہیں — یہ تیرہ آنے نہیں ہیں، زندگی کے تیرہ دن ہیں — تیرہ ماہ ہیں —— تیرہ سال ہیں —— تیرہ صدیاں ہیں —— میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میں انہیں کبھی نہ دوں گا۔ کبھی نہ دوں گا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی مٹھی پتلون کے اندر اور بھنچ گئی۔ اس کا نچلا جبڑا اس کے اوپر کے جبڑے سے اس زور سے لگ کر بند ہو گیا، گویا اب اسے کسی پیچ کش ہی سے کھولا جا سکتا ہو۔

میں کنڈکٹر نے کہا: "میں کہاں سے دوں، میں تو دے چکا۔ میرے پاس پہلے ہی پیسے نہیں تھے۔ اب کہاں سے دوں گا!"

اسے اپنی ماں کے لئے دوا کا خیال آیا، اور وہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے گلشن اور موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ لوگوں نے پیسے کہیں گرا دیئے ہوں گے!"

"گرا نہیں دیئے تھے، لاری سے باہر پھینک دیئے تھے۔" موتی نے طنزاً کہا: "اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ ہمیں ہمارے تیرہ آنے دے دو۔"

"تیرہ آنے ــــ!"

'ماں کی دوا کہاں سے آئے گی؟ صرف ایک روپیہ پانچ آنے تو میرے پاس ہیں' ـــ کنڈکٹر نے اپنے دل میں سوچا ـــ "اس میں سے تیرہ آنے گئے، تو پھر کیا بچا؟'

"تیرہ آنے ــــ!!"

رات بھر شوٹنگ کرو، اکسٹرا سپلائر کی گالیاں سنو۔ ڈائرکٹر کی جھڑکیاں، رت جگا، باسی چائے، کینٹین کی دال، دال کم اور کنکر زیادہ؟ سگرٹ، پان، کیا ان سب کے لئے تیرہ آنے کافی ہوں گے؟ کافی تو نہ ہوں گے۔ مگر یہ بھی نہ ملے تو پھر کیا ہوگا؟

' تیرہ آنے ــــ!!'

کون کہتا ہے۔ تیرہ آنے ہمارے نہیں ہیں؟ میں جو آٹھ دن سے بھوکا ہوں کہ دس دن سے بھوکا ہوں، کہ دس ماہ سے بھوکا ہوں، میں جو فٹ پاتھ پر سوتا ہوں اور مدھم مدھم آنچ کی طرح سلگنے والے بخار میں مبتلا ہوں۔ فٹ پاتھ جس کا بچھونا ہے، اور پولیس کے سنتری کی ٹھوکر جس کی قسمت ہے ـــــ میں تو تیرہ آنے سے بہت دن زندہ رہ سکتا ہوں!

یہ تیرہ آنے جو میری زندگی ہیں، اگر میرے نہیں ہیں، تو پھر

کس کے ہیں ؟
یکایک وہ تیرہ آنے گویا میرے لئے فضا میں اچھلے اور مجھ سے
پوچھنے لگے۔
ہم کس کے ہیں؟ ہم کس کے ہیں؟
اگر تم جانتے ہو تو بتادو ہم کس کے ہیں؟
وہ تیرہ آنے جڑ کر بلیڈ کی دھار کی طرح تن گئے۔ کتنی ہی زندگیاں
اس پر ناچ رہی تھیں —
ایک بس کنڈکٹر!
ایک بھکاری !!
دو سلے کار!!!
صرف تیرہ آنے — !!
پانچ ہزار برس کا کلچر، اجنتا، ایلورا، بخشش، سخاوت، فیاضی،
دریا دلی، دیا، دھرم، وسعت، بلوغت، فکر، ثقافت، کلچرل ڈیلیگیشن،
کتھا کلی، ابدی قدریں، اسلامی ادب، آریہ سماجی ادب، — جھنڈا
اونچا رہے ہمارا!
صرف تیرہ آنے — !!
بس کنڈکٹر کا چہرہ لٹک گیا۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنے

چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے۔ جیسے وہ اپنی ماں کے آخری سانس گن رہا ہو۔

موتی نے وہ آنے جلدی سے جھٹک کر اپنی جیب میں رکھ لئے وہ دونوں ــــ موتی اور گلشن اس طرح خلا میں دیکھنے لگے جیسے بس میں اُن کے سوا کوئی بیٹھا نہ ہو۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے دبلے پتلے آدمی نے زور کا سانس اندر کھینچا، اور پھر بالکل تن کر بیٹھ گیا۔ اس کے رخساروں کی رنگت بالکل سفید ہو گئی۔

میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس سے سخت گھن آئی۔ چور یہ ہے۔ چور یہ ہے۔ اور یہ صاف بچ کے نکلا جا رہا ہے میرے دل میں آیا کہ میں اسے چور کہہ دوں۔ میرا ایک لفظ اسے گرفتار کرا دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر نہ جانے وہ لفظ میرے منہ سے کیوں نہ نکلا۔ میں چپ چاپ اس کے پاس بیٹھا رہا۔

اس واقعے کے بعد کسی نے بس میں کسی سے بات نہ کی۔ کنڈکٹر بھی خاموش تھے۔ وہ دونوں نوجوان بھی۔ دوسرے مسافر بھی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر کچھ سوچ رہا تھا۔

اتنے میں اندھیری کا بس اسٹاپ آ گیا۔ وہ دبلا پتلا آدمی ایک

ہاتھ پتلون میں ڈالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بس کی آہنی سلاخ پکڑے ہوئے بس کے اندر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا گیا - میں بھی اندھیری پر اتر گیا، اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا - دراصل میرا جی یہ چاہتا تھا کہ میں اس کم بخت کو اتنا تو جتا دوں کہ میں نے اس کی یہ بری حرکت دیکھ لی ہے -

میں اُسے اتنا جتانا چاہتا تھا، اور صرف ایک بار انگلی اُٹھا کر اسے چور کہنا چاہتا تھا -

وہ تیز تیز قدموں سے اندھیری اسٹیشن کی طرف مڑ گیا - نکڑ پر ایک چنے والا بیٹھا تھا - آخری فاصلہ اس نے تقریباً دوڑ کر طے کیا - اور چنے والے کے پاس پہونچ کر دو آنے اس کی طرف پھینک کر وہ چنوں پر اس طرح جھپٹ پڑا جیسے کوئی مدتوں کا وحشی بھوکا جانور شکار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھا رہا ہو - اس کی نگاہوں میں قطعاً کسی قسم کی انسانیت نہ تھی - صرف ایک بھوک ہی بھوک تھی، اور ایک خشمگیں چمک!

جب میں اُس کے قریب سے گذرا تو پیشتر اس کے کہ میں اُس سے کچھ کہوں، وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنسا - پھر اس نے اپنی لانبی پتلی انگلی میری طرف اٹھائی اور بڑی سختی سے کہا -

"چور ـــــ !"

بے داغ فولاد

دادر سے وہ " ڈی " بس میں سوار ہوا۔ اوپر کی منزل پر جہاں میں بیٹھا تھا، ہانپتا ہوا آکر سیدھا میرے پاس کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے برابر کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی جس نے کولابے کا ٹکٹ لیا تھا اور سچ پوچھئے تو ایمان کی بات ہے اس قدر حسین تھی کہ اسے دیکھ کر قاعدے سے مجھے بھی کولابے کا ٹکٹ لے لینا چاہئے تھا مگر اس زندگی کی چلتی ہوئی بس کو کیا کہئے! جس میں یوں تو ہر مسافر ساتھی ہے، محبوب ہے، بھائی ہے، بہن ہے، خاوند ہے، بیوی ہے، ماں ہے، باپ ہے، بیٹا ہے، پھوپھا ہے اور چچا ہے۔ دوست ہے اور غم گسار ہے۔ لیکن جہاں ہر شخص کی منزل الگ الگ ہے۔ جہاں

ہر شخص باری باری سے بس کے اندر آتا ہے۔ باری سے اپنا ٹکٹ کٹاتا ہے اور سر جھکائے اپنی منزل پر اُتر جاتا ہے۔ دو جھٹکے اور بس آگے چل دی، اور کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کون تھے، کہاں سے آئے تھے، کدھر کو گئے، کیا اتنا ہی تمہارا ہمارا ساتھ تھا، کیا تمہارے بالوں کی اتنی ہی خوشبو، تمہاری نگاہوں کی اتنی ہی گرمی، تمہارے تبسم کی اتنی ہی ملائمت ہماری تھی۔ دو جھٹکے اور سانس غائب!

اس لئے میں نے گرانٹ روڈ کا ٹکٹ لے لیا۔ حالانکہ اس لڑکی نے کولابے کا ٹکٹ لیا تھا۔ بس کنڈکٹر نے جھک کر بڑی خندہ پیشانی سے اُسے ٹکٹ دیا تھا۔ لیکن میری طرف مڑتے ہی اس کی مسکراہٹ کائی کی طرح پھٹ گئی تھی۔

"کہاں کا ٹکٹ؟"

اس نے روزمرہ کے تجارتی لہجے میں پوچھا۔

"گرانٹ روڈ کا"

"نکالو تین آنے"

"او تین آنے!"

کھٹاک سے ٹکٹ حاضر۔ قصہ ختم۔ بس کنڈکٹر آگے چلا گیا۔ اُس کی پیشانی پر اب وہ نور نہ تھا جو ایک خوب صورت عورت کو دیکھنے

سے پیدا ہوتا ہے۔ خوب صورتی کا احساس نوجوانوں میں بھی ہوتا ہے اور بس کنڈکٹر ہر چند کہ مشین کی طرح کام کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن آخر انسان ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کے چہرے پر بھی وہ نگاہ کھِل اُٹھتی ہے جو پھول کی طرح محبت کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ بس کنڈکٹر نے اچھا ہی کیا جو وہ نگاہ مجھ پر ضائع نہ کی۔ حالانکہ مجھ سے پہلے اُس کی نگاہوں کا شرمیلا لہجہ بڑے مہذب طریقے سے بیان کر رہا تھا۔

"اے خوب صورت لڑکی! افسوس کہ بس صرف کولابے تک جاتی ہے۔ اگر کہیں آگے تک جاتی، اور وہاں تک جاتی جہاں تیرا گھر ہے تو میں وہیں کا ٹکٹ کاٹ دیتا!"

اس بس کنڈکٹر کی ادا دیکھ کر مجھے زندگی کے سب سے بڑے بس کنڈکٹر کا خیال آیا، جو باری باری ہر مسافر کو اس کی منزل پر اُتار دیتا ہے۔ اور پھر میں نے سوچا، موت ضرور ایک عورت ہے۔ موت اگر ایک مرد ہوتی تو کبھی کسی خوب صورت عورت کی جان نہ لیتی؛ صرف ایک عورت ہی رشک و حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کر سکتی ہے!

اب یہ تو معلوم نہیں کہ موت مرد ہے یا عورت۔ بہر حال، وہ آدمی جو دادر پر میرے پاس آ کر بیٹھا، وہ یقیناً مرد تھا۔ اور اس کے

بیٹھتے ہی اس کے بھاری بھرکم جسم کی اوٹ میں وہ لڑکی آ گئی، اور میں اس کے بعد اُسے نہ دیکھ سکا۔ ہاں اگر میری گردن بہت لمبی ہوتی اور اتنی خم دار ہوتی کہ آگے پیچھے بآسانی گھوم سکتی تو میں اُسے ضرور دیکھ سکتا تھا ـــــ ایسے موقعوں پر میرا جی چاہتا ہے کہ میں انسان نہ ہوتا، سارس ہوتا۔ کلنگ ہوتا، زرافہ ہوتا، شترمرغ ہوتا، اگر ہوتا تو کیا ہوتا؟

مگر اس بھاری بھرکم آدمی نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ چند لمحوں کے لئے اُس نے بس میں اِدھر سے اُدھر نگاہ ڈالی اور میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی آدمی منزل سے نیچے کسی کیڑے کو دیکھے۔ پھر چونک کر اپنی کمزور اور منحنی سی گردن کے گرد پھٹے ہوئے کالر اور بوسیدہ ٹائی کو ٹھیک کیا۔

دراصل میں اس قسم کی نگاہ سے بہت ڈرتا ہوں۔ میں گرانٹ روڈ کے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں۔ تاریخ، جغرافیہ اور علم نباتات پڑھاتا ہوں۔ کبھی کبھی سوکس، انگریزی اور حساب بھی پڑھانا پڑتا ہے۔ تنخواہ بچاسی روپے ہے۔ گو رسیداً ایک سو پینتالیس کی کاٹتا ہوں۔ عرصہ تیس سال سے اسی مدرسے میں اسی تنخواہ پر کام کر رہا ہوں۔ اخلاقاً میرا شمار انسانوں میں ہوتا ہے۔ گو جہاں تک

آمدورفت کا تعلق ہے آپ مجھے عالم نباتات میں شامل کر سکتے ہیں
اور تنخواہ کے اعتبار سے عالم جمادات میں۔

کلاس کے اندر طالب علموں کی دھمکیاں سہتا ہوں، اور کلاس کے باہر ہیڈ ماسٹر اور منیجر اور بیوی کی گھڑکیاں برداشت کرتا ہوں۔ اور چونکہ مجھے ہر روز اس قسم کی نگاہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس نگاہ کو میں ہر جگہ پہچان جاتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے اس نگاہ کو فوراً پہچان لیا، جو گویا مجھ سے کہہ رہی تھی۔ 'اے ذلیل کمینے، دُبلے پتلے، مفلوک الحال انسان! تیری یہ مجال کہ تو اس طرح میرے ساتھ میری سیٹ پر بیٹھے؟

اُس نگاہ کے جواب میں میں مسکرا دیا۔ بہت ہی پھیکی اپنے آپ پر شرمندہ ہوتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ گویا ہاتھ جوڑ کر اس آدمی سے کہہ رہی تھی۔ جانے دو بھائی مجھ سے کیوں اُلجھتے ہو۔ ایک غریب آدمی ہوں۔ بیٹھا ہوں۔ بیٹھا رہنے دو۔ گرانٹ روڈ پر اُتر جاؤں گا۔ تمہارا کیا لیتا ہوں۔ اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھتے ہو۔ لو میں اور پرے ہوا جاتا ہوں۔

میں نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن اپنی سیٹ پر سمٹ کر اور سکڑ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا آدمی اس اعتبار سے اور پھیل گیا۔ اس نے اپنے تخفیف

پھلا کر مجھ سے پوچھا:

"کیا ٹائم ہے؟"

میں نے بڑے مسکین لہجے میں کہا۔

"جی میرے پاس گھڑی نہیں ہے!"

"اوہ!!"

اس آدمی کے لہجے میں نخوت کی مقدار اور بڑھ گئی۔ جس طرح ذیابطیس کے مرض میں شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے کنڈکٹر کو اپنے پاس بلایا اور اس سے وقت پوچھا۔

کنڈکٹر نے وقت بتایا۔ تو اس آدمی نے اپنی سونے کی گھڑی سے وقت ملاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری گھڑی غلط ہے!"

"ہوگی صاحب!"

"ہوگی نہیں"۔ اس آدمی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس۔ تم بس کنڈکٹر ہو اور ٹھیک ٹائم نہیں رکھتے۔ بھی تو بسیں لیٹ ہوتی ہیں۔ اور یہ بس بھی دادر کے اسٹاپ پر پانچ منٹ لیٹ پہونچی ہے۔ تم لوگوں کو مسافروں کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ ہمارا کتنا ہرج ہوتا ہے

یہ بھی تو خیال کیجئے ۔"

کنڈکٹر بولا۔" آج کل برسات کا زمانہ ہے۔ دن بھر بارش ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم برابر اسپیڈ سے گاڑی چلائیں تو کتنے حادثے ہوا کریں۔ پچھلے ہی اٹیم سے پانچ منٹ بعد پہنچتے ہو، مگر گھر تو پہونچ جاتے ہو سیٹھ صاحب!"

کنڈکٹر کی اس بات پر کچھ لوگ مسکرائے۔

میں تو مسکرانے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ کیوں کہ وہ آدمی میرے اس قدر قریب بیٹھا تھا۔

مگر اس کی تسلی کنڈکٹر کا جواب سن کر نہ ہوئی۔ اس نے فوراً سر ہلا کر کہا۔

"اسپیڈ سے کیوں نہیں چلا سکتے؟ ضرور چلا سکتے تھے، مگر سڑکوں کی حالت دیکھتے ہو۔ بارہ بارہ انچ کے گڑھے ہیں۔ گاڑی کا ایکسل بھی ٹوٹ جائے اگر تیز چلے۔ ابھی اُدھر ماٹنگا سے دادر آتے آتے میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سالا جدھر دیکھو، آج کل بے ایمانی کا راج ہے۔ پہلے سڑک پر کچی تہہ کے اوپر سیمنٹ کا ردّہ جمایا جاتا تھا۔ اس کے اوپر روڑی اور کولتار کی کارپٹنگ ہوتی تھی، آج کل خالی کچی مٹی کی تہہ پر کارپٹنگ ہوتی ہے۔ چھ مہینے میں سڑک

ٹوٹ جاتی ہے۔ ٹھیکے داروں کے مزے ہیں۔ شریف لوگوں کی گاڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ سالا اِدھر جو ہے چور ہے۔ بے ایمان ہے۔ لٹیرا، ٹھگ اور دھوکے باز ہے، دوسرا پنج سالہ پلان کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟"

اس کے بعد اس نے زیرِ لب بہت سی گالیاں سنائیں۔ وہ بہت خفا معلوم ہوتا تھا۔ وہ سانولا اور چیچک رو تھا۔ بال سیاہ اور بھنویں گھنی تھیں۔ چہرہ بھاری تھا، اور جسم بھی بھاری تھا، اور کمر کے نیچے اس نے ایسی شفاف دھوتی باندھ رکھی تھی کہ اُس کی ریچھ کی سی ٹانگوں کا ایک ایک بال نظر آرہا تھا۔

کنڈکٹر نے اس سے پوچھا ـــــ

"کہاں کا ٹکٹ؟"

"باہبے سنٹرل"

"ڈھائی آنے!"

سیٹھ نے اپنا بڑا بٹوہ کھولا ـــــ فراخ اور کشادہ بٹوہ! اس بٹوے سے چھوٹا تو میرا گھر تھا۔ جس میں اپنی بیوی اور پانچ بچوں اور ایک بوڑھی خالہ سمیت رہتا تھا۔

میں حسرت سے اس بٹوے کی طرف دیکھنے لگا۔ کتنا بڑا بٹوہ تھا یہ! کتنے ہی تو اس میں کمرے تھے۔ ایک ہزار ہزار روپوں کے

نوٹوں سے بھرا تھا اور ایک کمرہ سو روپے کے نوٹوں کے لئے تھا۔ ایک کمرہ دس روپے کے نوٹوں کے لئے۔ ایک کمرہ پانچ روپے کے نوٹوں کے لئے۔ ایک کمرہ ایک روپے کے نوٹوں کے لئے۔ ایک کمرے میں ریزگاری تھی۔ ایک کمرے میں ضروری کاغذات رکھے ہوئے تھے بٹوے کے بیچ میں ریشم کی ڈوری تھی۔

یہ نوٹوں سے جگمگاتا ہوا بٹوہ ایک عالی شان محل کی طرح خوب صورت تھا۔ میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا، جیسے میں اس حسین لڑکی کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا جو اب میری آنکھوں سے اوجھل تھی، میں دل ہی دل میں حساب کرنے لگا تیس سال میں نے مدرسی کا کام کیا، سال میں بارہ ماہ ہوتے ہیں، تو تیس سال میں تین سو ساٹھ مہینے ہوئے۔ ہر ماہ کی تنخواہ پچاسی روپے ہوئی، تو مجھے اب تک کیا ملا تیس ہزار چھ سو روپے۔ اس سے زیادہ کی رقم تو یہ سیٹھ اس وقت اپنے بٹوے میں دبائے پھرتا ہے ـــــ میری پوری زندگی اس بٹوے میں تھی۔

سیٹھ نے ریزگاری کے خانے سے ڈھائی آنے نکالے۔ کنڈکٹر کو دیئے، اور پھر بٹوہ بند کر کے اندر جیب میں رکھ لیا۔ اور لیکایک میں نے اپنے آپ کو اس کی جیب کے اندر جاتا ہوا محسوس کیا۔ اور

یکایک میں اس نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اوپر کا مطلب نہیں، وہ باطن کا گہرا، تہوں کے اندر بھی اندر سماج کا چھپا ہوا وہ گھناؤنا مطلب سمجھ گیا۔ جو یہاں کی ہر کتاب اپنے طالب علم سے، ہر اخبار اپنے پڑھنے والے سے، ہر حاکم اپنے محکوم سے چھپاتا ہے ——

"تم میری جیب میں ہو!

تم میری جیب میں ہو !!"

بٹوہ اندر کی جیب میں رکھ کے اس آدمی نے پھر چونکتا ہو کر میری طرف دیکھا، اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"گرانٹ روڈ پر ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں"۔

"ٹیچر ہو کر گھڑی نہیں رکھتے ہو، تو وقت پر اسکول کیسے جا سکتے ہو؟ وقت پر طالب علموں کو کیسے پڑھاتے ہوگے؟ مگر کس سے کہیں؟"

وہ آدمی بہت بُرا منہ بنا کر بولا۔ حالانکہ اس کا منہ اس سے پہلے بھی کچھ بُرا نہ تھا۔ "یہاں جو ہے کام چور ہے۔ کوئی کام سے جی چُراتا ہے تو کوئی وقت چُراتا ہے۔ کسی کو دیش کا خیال نہیں ہے۔"

میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں تو وقت ہی سے گھر سے چلا تھا۔ راستے میں دو بسوں پر

باری نہ آئی۔ تیسری بس ملی تو بارش ہونے لگی، اور ڈرائیور پھسلن سے ڈر کر بس آہستہ آہستہ چلا رہا ہے۔ اب کیا کریں؟"

"کیا کریں۔ جرمانہ ہونا چاہیے تم ایسے لوگوں پر --- جرمانہ، اور کیا؟ مجھے دیکھو! میرا کرلا میں بے داغ فولاد Stainless Steel) کا کارخانہ ہے۔ ڈھائی سو مزدور کام کرتے ہیں۔ مگر کیا مجال جو کوئی وہاں ایک منٹ بھی لیٹ پہونچے۔ جرمانہ کر دیتا ہوں، پگار میں سے کاٹ لیتا ہوں یا اوور ٹائم کرنے کو کہتا ہوں۔ مگر یہاں کس سے کہوں؟ وہ تو میرا کارخانہ ہے۔ یہاں کس سے کہوں؟" سیٹھ نے جھنجلا کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر پاس ہے سنٹرل کی بڑی عمارت پر لگے ہوئے بڑے کلاک کی سوئیوں سے صحیح وقت کا اندازہ کیا اور زور سے سانس اندر کھینچ کر چلایا۔

"میں تو دس منٹ لیٹ ہو گیا، اپنی اپوائنٹ منٹ سے!!"

"کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے ڈھارس دیتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "آپ سیٹھ صاحب جہاں بھی جائیں گے، لوگ آپ کا انتظار کرتے ہوں گے۔"

"انتظار میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے مسٹر!" سیٹھ نے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے بزنس سے ہر منٹ پانچ روپے کا فائدہ ہوتا

ہے۔ دس منٹ بے کار ہو گئے تو سمجھو پچاس روپے گئے۔ وقت روپیہ ہے مسٹر وقت روپیہ ہے!!"

وقت کے متعلق انسان کے مختلف نظریے ہیں:

وقت روپیہ ہے۔

وقت کون و مکاں کی چوتھی حد ہے۔

وقت کائنات کا چوکھٹا ہے۔

وقت شعور کا دھارا ہے، جو ماضی، حال اور مستقبل کے گرد ایک دائرے کی صورت گھوم رہا ہے۔

وقت ایک بوڑھا ہے جسے صرف اس کے ماتھے کے بالوں سے پکڑا جا سکتا ہے۔

وقت شب انتظار ہے یا انبساطِ وصال،
کسی کا پہلا بوسہ ہے تو کسی کی آخری ہچکی۔
کسی کے لئے تخت ہے تو کسی کے لئے تختہ!

مگر یہ سب تاویلیں غلط ہیں۔ وقت دراصل ایک بٹوہ ہے جس میں ایک مدرس کی تیس سالہ زندگی کے تلخ ایام بند ہیں!

میں نے بڑے حسرت ناک لہجے میں سیٹھ سے پوچھا۔

"سیٹھ! یہ بے داغ فولاد کیا ہوتا ہے، جس سے تم فی منٹ

پانچ روپے کماتے ہو؟"

"ٹیچر ہو کر یہ نہیں جانتے؟ ارے کیا خاک ٹیچر ہو! کیا پڑھاتے ہو گے تم اپنے طالب علموں کو؟ ارے بدھو! —— یہ 'بے داغ فولاد' (Stainless Steel) ہوتا ہے۔ اسے زنگ نہیں لگ سکتا۔ اس کے برتن بنائے جاتے ہیں۔ یہ گھڑی جو تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو، یہ بھی اسی بے داغ فولاد کی ہے۔ اس کا رنگ کبھی خراب نہ ہوگا۔ اسے مٹی میں ڈال دو۔ پانی میں پھینک دو۔ اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوگا!"

"کمال ہے بھئی!" میں نے حیرت سے کہا: "تو صرف برتن اور گھڑیاں ہی بے داغ فولاد کی بنتی ہوں گی؟"

"نہیں!"

سیٹھ نے میری لاعلمی پر مسکراتے ہوئے کہا

"سیکڑوں چیزیں بے داغ فولاد کی بنتی ہیں!"

"تو انسان بھی بنتے ہوں گے؟" میں نے پُر امید لہجے میں پوچھا

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"ایسے انسان جن پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو۔ بے داغ فولاد کے انسان!"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔
میں نے اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔
"سیٹھ تم بھی مجھے بے داغ فولاد کے انسان معلوم ہوتے ہو۔ ایسا انسان جس میں کہیں پر سقم اور خامی نہ ہو، کس قدر سچے، اور دیانت دار، مضبوط اور وقت کے پابند۔ سچ کہتا ہوں اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہارے ایسے انسان کو ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دوں"۔
وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوا۔ بولا:
"میں دو سال میں ہندوستان کی کایا پلٹ کے رکھ دوں، سارا ملک ایک کارخانے کی طرح کام کرنے لگے۔ ہر انسان مشین کی طرح چلنے لگے۔ میں تو سب کو دو دن ہی میں ٹھیک کر کے رکھ دوں۔ مگر کیا کروں، آج کل تو جدھر دیکھو جنتا راج، جنتا راج کی بکواس سنتا ہوں۔ جنتا راج ہونہہ!!"
اتنے میں گرانٹ روڈ کا اڈہ آ گیا۔ اور میں وہاں اُترنے لگا۔ وہ بھی میرے ساتھ نیچے اُتر آیا۔
یکایک مجھے خیال آیا تو میں نے ملیٹ کراس سے کہا۔
"سیٹھ، آپ مجھ سے باتیں کرتے کرتے غلطی سے یہاں گرانٹ روڈ

تک سے چلے آئے۔ حالانکہ آپ کو پچھلے اڈے پر بابے سنٹرل پر اُترنا تھا۔"
وہ ہنس کر بولا۔

"نہیں، دراصل مجھے گرانٹ روڈ ہی پراترنا تھا۔ میں ہر روز یہیں پر اُترتا ہوں۔ ایک ڈھائی آنے کا ٹکٹ بابے سنٹرل کا لیتا ہوں اور یہاں گرانٹ روڈ پر آکے اُتر جاتا ہوں۔ ہر روز ٹکٹ میں دو پیسے کی بچت ہو جاتی ہے۔ یہاں کون دیکھتا ہے ؟"

اِتنا کہہ کے اس نے میری طرف دیکھ کے آنکھ ماری، اور جلدی جلدی تکرٹ سے گھوم کر غائب ہو گیا۔

دل کسی کا دوست نہیں

میں اور میرا دوست کاچرُد جوہو کے نائس ہوٹل میں بیئر پی رہے تھے۔ ہمارے سامنے ساحل تھا، ساحل کے سامنے سمت۔ رتھا سمندر کی لہروں پر جھاگ تھا۔ بیئر کے گلاسوں پر بھی جھاگ تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے سفید جھاگ کی طرح اُڑتے ہوئے بادل مسرّت کا کف معلوم ہوتے تھے ساحل کی ریت پر کھڑا ایک گوانی اسپینی گیٹار بجا رہا تھا، اس کے قریب ایک نوجوان مرد اور عورت باہوں میں باہیں ڈالے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان سپنوں کو دیکھ رہے تھے جو صرف جوانی میں کھلتے ہیں۔

مضبوط اور سانولا لڑکا بے حد وجیہہ اور پرُوقار معلوم ہوتا تھا۔

گورے رنگ کی اینگلو انڈین لڑکی اپنے بڑے گیسوؤں کو جھٹکاتی ہوئی بے حد خوب صورت معلوم ہوتی تھی ——— اور ہم دونوں بڑھے ہو چکے تھے۔ اس لئے کاچرو سے نہ رہا گیا۔ اس نے تلخی آمیز لہجے میں کہا۔ "سالی ماڈرن چھوکری !!"

"ہیئر پیو — بیئر۔ یہی آخری سہارا ہے !" میں نے نرمی سے کہا، اور گلاس اُٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا۔

کاچرو نے ایک ہی سانس میں گلاس آدھا کر دیا۔ اور اُسے میز پر رکھ کر اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔

کاچرو ایک جہاں دیدہ شکی تھا۔ اور سنڈے ٹائمز کا نائب مدیر تھا۔ میں ریجس ہوٹل کے بینڈ میں کلارنٹ بجاتا تھا۔ ہم دونوں پرانے دوست تھے۔

"اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے کیٹ یاد آتی ہے !"

"کیٹ ؟" کاچرو نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں کیٹ !" میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ بھی اسی کی طرح ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ اور میں بھی تمہاری طرح اسے ایک سالی سمجھتا تھا !"

"کیا قصہ ہے ؟ جلدی جلدی جبڑا چلاؤ !" کاچرو نے جھلا کر کہا میں یادوں میں کھو گیا۔ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

"اسی طرح کی خوب صورت شام تھی۔ یہی نائس ہوٹل تھا۔ فضا میں اسی طرح نشہ بسا ہوا تھا۔ میں زندگی سے بیزار اور اُکتایا ہوا اسی طرح بیئر پی رہا تھا۔ اور آسمان پر ان رنگین شفق آمیز گلگوں بادلوں کو دیکھ رہا تھا جو خوب صورت یادوں کی طرح ذہن کے دریچے میں جھلملاتے ہیں!"

"یہ بکواس بند کرو۔" کاچرو بولا۔ "منظر نگاری بند کرو۔ سیدھے سیدھے بتاؤ وہ کون تھی؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور پھر پریشان ہو کر اپنی گنجی چاند پر ہاتھ پھیرنے لگا!

کاچرو نے مسکرا کے پوچھا۔ "وہ بہت خوب صورت ہوگی!"

میں نے کہا: "میں نے ساحل کی ریت میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بیئر کا گلاس رکھ دیا تھا، تاکہ بیئر ٹھنڈی رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد میں ایک گھونٹ پی لیتا تھا۔ میں نے غسل کا لباس پہن رکھا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ کتنے منٹ میں میں اس گلاس کو ختم کر کے سمندر میں تیرنے کے لئے جاؤں گا کہ اتنے میں ساحل کی لہروں میں ہلچل پیدا ہوئی، اور سمندر کی لہروں سے ایک لڑکی نکلی۔"

"زہرہ کی طرح سمندر کے کف سے؟" کاچرو نے طنزاً پوچھا۔

"بالکل!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے

بڑے گیسوشہ لزن پر لٹیں بن کر آ گئے تھے۔ اس کے بھیگے ہوئے جسم پر کہیں کہیں سمندر کا سفید جھاگ تھا۔ اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں، اور وہ کسی نئے ماڈل کی گاڑی کی طرح خوب صورت، چھریری اور نازک اندام تھی۔

"پانی میں دھل کر گاڑی اور بھی چمک جاتی ہے!" کاپچرو بولا۔

میں نے کہا "ہیلو خوب صورت جسم!"

وہ بولی — "ہیلو گنجے!"

وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ تیرنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سینہ پھڑک رہا تھا۔ میں نے تالی بجا کر نائس ہوٹل کے بیرے کو بلایا اور اسے ایک بیئر کا آرڈر دیا۔

پھر میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم وینس ہو؟"

"نہیں!" وہ ہنسی، اور اپنے بھیگے ہوئے سنہری بالوں کو نچوڑنے لگی "میرا نام کیٹ ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے کلیان داس کہتے ہیں۔"

"کس کا کلیان کرتے ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا

"کلیان تو اپنا کرتا ہوں۔ داس تمہارا ہوں!"

وہ زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں بڑی بے تکلفی تھی۔ "ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔"

"شور؟" کاچرو نے مجھے پہلی بار تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"وہ بڑا سستا زمانہ تھا۔" میں نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا: "بیئر کا ایک گلاس چھ آنے میں ملتا تھا۔ پیٹرول کا ایک گیلن گیارہ آنے میں آتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے معدے کی ٹنکی کو بیئر سے بھر لیا، اور موٹر کی ٹنکی کو پیٹرول سے۔ اور ہم دونوں بمبئی میں اُڑتے پھرے۔ بہت خوب صورت دن تھا وہ۔ اُن دنوں میرے پاس رائلے کی ریس کار تھی۔ ٹو سیٹر۔ ہم دونوں راستے بھر پاس پاس بیٹھے گندے لطیفے بیان کرتے رہے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہنستے رہے۔ کبھی کبھی ایک کھلی بے باک ہنسی سے بے باک چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔"

"میں جانتا ہوں!" کاچرو آہستہ سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خوب صورت یاد کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ دوسرے لمحے میں معدوم ہو گئی۔۔۔

"پھر تم اُسے کس ہوٹل میں لے گئے؟" اس نے لہجہ بدل کے کاروباری انداز میں پوچھا۔

"وہ بعد کی بات ہے! تم سنو تو۔" میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "اس

سے پہلے تو وہ مقام آتا ہے جب مرد عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ ایسے موقعے پر ہماری ہندوستانی لڑکی کس طرح ایک شعلے کی طرح بھڑک جایا کرتی ہے۔ لیکن جب میں نے کیٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اسے گویا کچھ محسوس ہی نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی ہاں مجھے کچھ محسوس ہوا۔"

"تمہیں کیا محسوس ہوا؟"

"جیسے میرا ہاتھ کسی عورت کی کمر کے گرد نہ ہو، برف کی ایک سل کے گرد ہو!"

"ٹھیک ہے۔ ان اینگلو انڈین لڑکیوں میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔"

"پھر جب میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما، تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں ہونٹ نہیں چوم رہا ہوں، آئس کریم کھا رہا ہوں۔ اور تم جانتے ہو آئس کریم کھانے میں اور ہونٹ چومنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

کاچرو نے کہا: "میں جانتا ہوں۔ جب ہونٹ بار بار غیر مردوں سے چومے جائیں تو ان میں سے عورت کا سارا رس نکل جاتا ہے، صرف آئس کریم باقی رہ جاتی ہے۔"

"مجھے حیرت تو بڑی ہوئی، مگر کچھ اُلجھن سی بھی ہوئی۔ یہ کیسی لڑکی ہے اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے، یہ بے حد اوباش

اور آوارہ لڑکی ہے۔ اس لئے میں اسے بلا تکلف ایک ہوٹل میں لے گیا۔ کمرے کے اندر جا کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی سینڈل کی ایڑیوں سے فرش کو بجانے لگی۔ یکا یک رک کر بولی۔

"اب؟"

میں اس کی طرف بانہیں پھیلا کر بڑھا۔

یکا یک وہ اور زور سے ہنسنے لگی۔

میں رک گیا۔ میری بانہیں نیچے گر گئیں۔ میرا خیال ہے میں اس وقت انتہائی احمق معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے ذرا غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ برابر ہنسے جا رہی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ہنسی روکی، اور آخر بولی۔

"اچھا تماشہ رہا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بڑے احمق ہو۔ جب تم نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا، اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے۔ جب تم نے مجھے چوما، اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے مسٹر؟"

وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے۔ اور میرے شانوں پر اس کی گرفت بے حد مضبوط ہو گئی — وہ آہستہ سے بولی۔

"مسٹر ہیتبی یہ تک معلوم نہیں کہ عورت کسی سے محبت کرتی ہے کب محض ایک دوست کی طرح اس کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ کب وہ آگ ہوتی ہے۔ کب برف بن جاتی ہے؟ مسٹر! تم نے کبھی برف گرتے ہوئے دیکھی ہے؟"

میں نے محجوب ہو کر کہا "اب دیکھ رہا ہوں"

"تو اس سے سبق سیکھو۔ اور ہمارے شوخ چنچل انداز سے ہماری لگاوٹ کی باتوں کا غلط مطلب نہ لو۔ زندگی بہت لمبی ہے۔ اور ہم اس دنیا میں تمہاری عورتوں کی طرح منہ بسورے بیٹھے گزرنا نہیں چاہتیں، اس لئے خوش وقتی کو محبت مت سمجھو۔ کسی عورت کا جسم اتنا سستا نہیں ہوتا جتنی مرد کی نگاہ سستی ہوتی ہے!"

"مجھے معاف کر دو بہن" میں نے جھلا کر کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس خوش وقتی کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا لکچر بندھا ہوا ہے تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ لاتا!"

یکایک میرے اداس چہرے کو دیکھ کر اسے ترس آ گیا۔ وہ مسکرا دی

اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں سے ہٹا لئے ۔ اور اک دم پرسکون آواز میں بولی ۔

"جاؤ تمہیں معاف کیا ۔ تم مجھے برے آدمی نہیں معلوم ہوتے ہو اور تمہارے ساتھ آج کا وقت بہت اچھا گزرا ۔ نہیں تو میں آج رو دیتی!"

" تو کیا تمہیں بھی؟" —— میں نے رُک کر پوچھا —— "کسی سے محبت ہے؟"

"اور تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں سمندر کے ساحل پر تمہیں درشن دینے آئی تھی؟" اُس نے آہستہ سے محزون لہجے میں کہا: "آج ہم دونوں نے پروگرام بنایا تھا، کہ دن بھر جُوہو پر پھیریں گے، اور شام کو پکچر دیکھیں گے! —— مگر وہ کم بخت آیا ہی نہیں!"

"وہ کون؟"

"ڈیوڈ!"

"کون ڈیوڈ!؟"

"میرا ڈیوڈ!"

یکایک وہ کرسی پر اُداس ہو کر بیٹھ گئی ۔ اور اُس نے کسی معصوم بچے کی طرح اپنا چہرہ لٹکا لیا جس کے ہاتھ سے مٹھائی چھینی جا چکی ہو ۔

میں نے کہا "پکچر تو میں تمہیں دکھا سکتا ہوں"

وہ بولی: "پکچر تو میں ضرور دیکھوں گی — !"

"راؤنڈ ٹو!" کا چہرہ طنزاً مسکرا کر بولا۔

پکچر میں مَیں بڑے قاعدے اور سلیقے سے بیٹھا رہا۔ کسی طرح کی پیش دستی میں نے نہیں کی۔ آخر اس نے خود ہی مجھ پر رحم کھا کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ کہہ کر:

"لو اسے تم رکھ سکتے ہو!"

ہاتھ نرم اور گرم ہی تھا۔ لیکن جتنی دیر میں تھیٹر میں بیٹھا رہا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اپنے ہاتھ میں ایک عورت کا ہاتھ نہیں ایک ہتھوڑا لئے بیٹھا ہوں۔

پکچر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا باپ ایک انگریزی فرم میں اسٹینو تھا۔ ماں فورج لیس ویکائی تھی۔ دونوں مجھ سے بڑی سرد مہری سے ملے۔ کیوں کہ ابھی ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا — اور حالانکہ مجھے دن رات مغربی لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ اپنا پیشہ ہی

ایسا ہے۔ پھر بھی میری بے تکلف خوش اخلاقی پر ان کی سرد مہری سے اداس سی پڑ گئی۔

میں وہاں چند منٹ ہی رکا۔

کیٹ باہر پورچ تک مجھے چھوڑنے آئی۔ کیٹ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا ملال تھا۔ بولی۔

"یہ ـــ میرے ماں باپ پرانے لوگ ہیں۔ یہ نہیں بدلیں گے!"

"مجھے معلوم ہے۔ اچھا گوڈ بائی۔" میں اس سے ہاتھ ملا کے جانے لگا ـــ

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "تم مجھے چوم سکتے ہو۔"

"نہیں!" میں نے غصے میں کہا، اور ہاتھ چھڑا کے جانے لگا۔

وہ بولی "ہمارے ہاں دو طرح کا بوسہ ہوتا ہے۔ ایک میں دوستی ہوتی ہے اور رشتے داری۔ دوسرے میں محبت! ایک میں نہایت گہرا جذبہ شامل ہوتا ہے، دوسرے میں صرف آداب! تم لوگ طور طریقوں سے غلط اندازہ لگاتے ہو۔ اس لئے میں چاہتی ہوں تم مجھے نہایت پاکیزگی سے چومو۔"

"اوہ! کس قدر غصے سے بھرے بیٹھے ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

لیکن اس نے میرے ہاتھ کو نہیں چھوڑا۔

"تم ہندوستانی بہت عمدہ رقیب ثابت ہو سکتے ہو!"

"مجھے جانے دو اب!" میں نے کہا۔

"پھر کب ملو گے؟"

"سالی! چال باز!!" اب کا چرو غصے سے بولا "اسی طرح ڈور باندھ کر کھینچتی ہیں یہ لڑکیاں!"

"میں بھی اس وقت یہی سمجھا تھا" میں نے کاچرو سے کہا۔" اس لئے میں نے دوبارہ ملنے کے لئے ہاں کر دی۔ اس نے مجھے دوسرے دن گرین میں آنے کو کہا۔ جہاں سو لجر لوگوں کے لئے بال ہونے والا تھا۔ اتفاق سے اُس روز ریکس میں کیبرے نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ہاں کر دی۔

چلتے چلتے کیٹ نے کہا ــــ "ضرور آنا ــــ میں تمہیں ڈیوڈ سے ملاؤں گی!"

"واہ! ڈھیل دے کر پھر کھینچا!" کاچرو نے مُٹھی کس کے کہا۔ "یہ ــــ بڑی حرافہ ہوتی ہیں۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں"

"جانتا تو میں بھی ہوں۔ اور میں بال میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ڈیوڈ کو دیکھنے کا اشتیاق مجھے وہاں کھینچ کر لے ہی گیا۔ اس زمانے میں میں بھی جوان تھا، اور شکل و صورت بھی میری بُری نہ تھی۔ اس لئے

میں ڈیوڈ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ آخر اس میں ایسے کون سے لعل ٹکے ہیں! پہلے تو میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پڑا پڑا اپنے کمرے میں وہسکی پیتا رہا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں اپنی رائفل نکال کر گرین پہونچ ہی گیا۔

اس وقت آدھی رات گذر چکی تھی اور بال زوروں پر تھا۔ ہیری کا بینڈ ایک تیز والز کی گت بجا رہا تھا۔ کیٹ اس وقت ڈیوڈ کی باہنوں میں ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے میں غصے میں گرین کی سیڑھیاں چڑھ گیا، اور بال روم میں جا پہونچا۔

وہاں ڈیوڈ کہیں نہیں تھا۔ اس کی کیٹ موجود تھی۔ اور ایک بڈھے پارسی کے ساتھ بڑی بے دلی سے ناچ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اس سے معافی مانگ کے الگ ہوگئی، اور ٹیبل پر آ بیٹھی۔

"تم نے اتنی دیر لگا دی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈیوڈ نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟" وہ محزوں لہجے میں بولی "میں نے اسے ٹیلی فون کیا تھا۔ اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وہ ضرور آجاتا۔ مگر تم جانتے ہو، یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ عین موقعے پر اس کی ڈیوٹی لگ گئی ہوگی!"

"ڈیوڈ کیا فوج میں ہے؟"

"ہاں کارپورل ہے!"

"کہاں کا رہنے والا ہے؟"

ہے تو امریکی یہودی۔ نیویارک کا رہنے والا ہے۔ مگر مجھ سے بے حد پیار کرتا ہے۔"

"تو اس وقت تک کیوں نہیں آیا؟"

"آجائے گا۔ جب تک تم میرے ساتھ ناچو!"

ہم لوگ صبح چار بجے تک ناچتے رہے — مگر ڈیوڈ نہیں آیا۔

آہستہ آہستہ ہال کی روشنیاں پھیکی پڑتی گئیں۔ اندھیرا دور ہوتا گیا۔ ہال کے فرانسیسی دریچوں سے گیٹ وے آف انڈیا کے خوب صورت نقش ونگار ہویدا ہونے لگے۔ سمندر پر پھیلا ہوا کہرا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔

پھر یکایک بینڈ خاموش ہو گیا۔

دور کہیں سے سمندر میں چلتی ہوئی کسی موٹر بوٹ کی چک چک سنائی دے رہی تھی۔

یکایک کیٹ ایک کرسی پر گر پڑی، اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔

اس کا سینہ زور زور سے چل رہا تھا۔

'چگ! چگ!' موٹر بوٹ کہیں دُور جا رہی تھی۔

میرا خیال ہے۔ یہ سب فراڈ تھا! دھوکا جو تم سے کیا گیا!" کاجیر نے رائے دیتے ہوئے کہا۔" دراصل ڈیوڈ کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ سارا قصہ تمہیں جال میں پھنسانے کے لئے گھڑا گیا تھا۔"

"میں نے بھی یہی سمجھا۔ اور اس کے بعد جو دو تین ملاقاتیں ہوئیں اس میں اس نے جو فاصلہ رکھا مجھ سے" اور جس طرح بار بار وعدہ کر کے مجھ سے ڈیوڈ کو نہیں ملایا۔ اس سے یقین قوی ہوتا گیا کہ دراصل ڈیوڈ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ سب مجھے پھنسانے کے لئے اداکاری کی جا رہی ہے۔

اس کے بعد جب کیٹ نے مجھ سے ایک روز تین سو روپے مانگے تو اس دن تو مجھے یقین ہو گیا کہ کیٹ بھی ایک سستے ٹائپ کی چھوکری ہے۔

میں نے پوچھا: "تمہیں تین سو روپے کیوں چاہئیں؟"

"میں ڈیوڈ سے شادی کر رہی ہوں۔"

"تو شادی تمہارے ماں باپ کریں گے۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں تین سو روپے دینے والا۔"

"میرے ماں باپ اس شادی کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں: ڈیوڈ ایک یہودی ہے۔"

"یہودی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم لوگ رومن کیتھولک ہیں۔ ڈیوڈ یہودی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں مانتے۔ کیوں کہ ڈیوڈ مجھ سے شادی کر کے مجھے اسرائیل لے جانا چاہتا ہے۔"

"تم اسرائیل جاؤ گی؟"

"ہاں جاؤں گی۔ جہاں ڈیوڈ لے جائے گا وہاں جاؤں گی۔"

"مگر اسرائیل ایک بنجر اور ویران علاقہ ہے۔"

"وہاں ڈیوڈ تو ہوگا۔ اور جہاں ڈیوڈ ہوگا، وہاں بہار آ سکتی ہے۔ وہاں بہار کو آنا ہی ہوگا۔ ڈیوڈ کہتا ہے۔ ہم لوگ وہاں بنجر زمینوں میں کاشت کریں گے۔ اپنے ہاتھ سے ہل چلائیں گے۔ ایک نئے ملک کی تعمیر کریں گے۔ ڈیوڈ سے میرے بچے ہوں گے۔ میں انہیں عبرانی زبان

میں پرانی انجیل پڑھاؤں گی۔ جب خدا کا حکم شعلہ بن کر کوہِ طور پر چمکا،
اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا۔ جانتے ہو؟"
میں نے سر جھکا کر کہا: "جانتا ہوں۔ تمہارا حکم کیا ہے۔ تمہیں
تین سو روپے چاہئیں نا؟ یہ لو۔ ان کا کیا کرو گی؟"
"چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز چلا جائے گا۔ اس سے پہلے
ہماری شادی ہو جانا چاہیے۔ میں اس رقم سے اپنی شادی کا جوڑا تیار
کراؤں گی۔ تم میری مدد کو نہ آتے تو میں مرجاتی۔"
یکایک اس نے مجھے چوما اور بھاگ گئی۔

چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز جانے والا تھا۔ اور شادی کی
تاریخ پچیس کو طے ہوئی تھی۔
کیٹ نے مجھے خاص طور پر بتلایا تھا ——
"چرچ گیٹ اسٹریٹ کے عقب میں جو پرانا گرجا ہے۔ وہاں
شادی کی رسم ادا ہوگی۔ پچیس اگست کو۔ بھولنا نہیں!"
"نہیں بھولوں گا!"

"ڈیوڈ کی طرف سے دو دوست آئیں گے۔ میری طرف سے صرف تم ہوگے! ضرور آجانا!"

"ضرور آؤں گا!"

"پچیس اگست کو تم گئے ہوگے۔ اُس گرجا میں؟" کاچرو نے مسکرا کر کہا۔

"ہوں!"

"اور ڈیوڈ حسبِ دستور نہیں آیا ہوگا؟"

"ہاں! وہ تو نہیں آیا تھا!" میں نے حیرت سے کاچرو کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"پھر تم نے — مسٹر جوزف کلیان داس تم نے اس لڑکی کی حالت پر رحم کھا کر اس سے شادی کی درخواست کی ہوگی؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم!"

"جو روتے روتے منظور کرلی گئی ہوگی؟"

"جو نامنظور کردی گئی!"

"ارے؟" یکایک کاچرو حیرت سے بولا۔ پھر اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کم بخت بہت چالاک نکلی — بھئی بہت ہوشیار نکلی!"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں اس کی بات بالکل نہ سمجھ سکا۔

"اچھا تم آگے بتاؤ۔ میں بالکل آخر میں بتاؤں گا"

میں نے کہا "سپید عروسی جوڑے میں کیٹ کس قدر حسین اور پاکیزہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تقدس تھا اور اس کی چال میں ایک عجیب طمانیت اور ٹھہراؤ۔ اب وہ برق صفت سیماب آسا لڑکی نہ تھی۔ ایک عورت تھی۔ ایک ماں تھی۔ ایک گھر تھی۔ ایک جنت تھی۔ ایک کائنات تھی۔ جس کی پہنائیوں میں تخلیق اور تہذیب کے گہوارے......"

"فلسفہ نہیں چاہیئے۔ کہانی سناؤ" 'سنڈے ٹائمز' کا سب ایڈیٹر کاچرو ایک دم کاروباری انداز میں بول اٹھا۔ "جب ڈیوڈ نہیں آیا، اور گرجے میں تم نے دیر تک انتظار کیا۔ اور جب کیٹ رو رو کر باؤلی ہو گئی۔ اور تم نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ تو پھر کیا ہوا؟"

"اس نے زور سے میرے منہ پر طمانچہ مارا، اور روتی ہوئی گرجے سے باہر نکل گئی، اور ٹیکسی میں بیٹھ کر یہ جا۔ وہ جا....."

"ارے ہے" کاچرو ذرا حیرت سے بولا۔ "پھر تمہیں وہ کب ملی؟"

اس کے بعد کئی ماہ تک وہ مجھے نہیں ملی۔ میں اسے ڈھونڈتا رہا

چھبیس اگست کو میں پرنس ڈاک پر گیا تھا۔ جس جہاز سے ڈیوڈ کو جانا تھا۔ مگر مجھے وہ وہاں پر بھی کہیں نظر نہ آئی۔ گھر گیا تو وہاں پر بھی نہ ملی۔ اس کے باپ نے مجھے ایسی قہر بھری نظروں سے دیکھا کہ میں نے وہاں دوبارہ جانا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس واقعے کے چند ماہ بعد وہ مجھے ریکس ہوٹل کے کیبرے میں مل گئی۔ اچانک، ایک دم، وہی شوخ چنچل اداؤں والی کیٹ۔ جیسے اسے کوئی پرانی بات یاد نہ رہی تھی۔ بہت جلدی ہم دونوں گھُل مل گئے۔

اب وہ میری بیوی ہے!"

کاچرو کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ جلدی میں وہ گلاس اٹھا کر خالی کر گیا۔ اور مسکرا کر بولا: "دوست۔ کچھ بھی کہو۔ تمہاری بیوی تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ مگر یہ ایک انوکھا ڈھونگ اس نے تم سے شادی کرنے کا رچایا تھا۔ میں اس کے نرالے چرتر کی داد دیتا ہوں!"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ اگر کبھی میں چڑانے کی خاطر کیٹ سے ڈیوڈ کا ذکر کرتا، تو وہ ہنس کر کہتی: وہ تو ایک ادا تھی تمہیں لبھانے کے لئے۔ اور تم اس میں پھنس گئے۔ ورنہ ڈیوڈ کا وجود ہے کہاں؟"

لیکن کبھی کبھی مجھے شبہ بھی ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، جب

میرا بڑا لڑکا پیدا ہوا، تو اس نے اس کا نام ڈیوڈ رکھا! کیوں؟"

"تمہیں چڑانے کے لئے!"

"کبھی کبھی رات میں سوتے سوتے بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے۔

"ڈیوڈ! ــــ میرے ڈیوڈ!!"

"تمہیں جلانے کے لئے یہ سب تریا چرتر ہے۔ میں جانتا ہوں!"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ مگر آج یہ خط آیا ہے۔ میری بیوی اس وقت غسل خانے میں تھی۔ میں نے ڈاکیے سے لے لیا۔ لیکن جب میں نے اس پر اسرائیل کا ٹکٹ دیکھا تو میں چونک گیا۔ میں نے جلدی سے خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔"

کا چہرہ میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگا۔

میں نے خط اس کے سامنے رکھ دیا۔

کا چہرہ دیر تک اس خط کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسے پڑھے بغیر میری طرف سرکا دیا، اور بولا۔

"اس میں کیا لکھا ہے؟"

میں نے کہا "اس میں ڈیوڈ کی تصویر ہے؟ ڈیوڈ کا خط ہے۔ پانچ سو پونڈ کا ایکسچینج ڈرافٹ ہے۔ ڈیوڈ اسے اسرائیل بُلا رہا ہے"!

کا چرو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ میں نے اس کے جذبۂ ترحم کو عشق سمجھا۔ حالانکہ میں اُس کے لئے اس کا عاشق نہ تھا ـــ میں تو ایک رومال تھا، جس سے وہ کبھی کبھی اپنے آنسو پونچھ لیا کرتی تھی۔ ایک بٹوہ تھا جس سے وہ کبھی کبھی پیسے نکال لیا کرتی تھی۔ ایک اندھیرا کونہ تھا جہاں وہ کبھی کبھی اپنی زندگی کے راز لوگوں کی نظروں سے چھپا کے رکھ دیا کرتی تھی!"

"اب تم کیا کرو گے؟" کا چرو کی نگاہیں اپنے خالی گلاس پر جم گئیں۔

"میں اسے اس کا خط دے دوں گا۔ اور بنجر زمینوں میں بہار آجائے گی۔ اور جو جس کا ہے وہ اس کا ہو جائے گا۔ اور خوابوں میں ماں نے جس کے بچوں کا منہ چوما تھا، وہی بچے سینوں کے جزیروں سے سرکتے ہوئے آئیں گے اور زیتون کے پیڑوں کی چھدری جھاڑی میں یا جھکتے ہوئے انجیروں کے خنک سایوں میں پرانی عبرانی زبان میں قدیم انجیل پڑھیں گے۔ جب خدا کا حکم شعلہ بن کر کوہ طور پر چمکا، اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا......"

میں نے خط اٹھا کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے اپنی جیب میں

رکھا، اور باہر ساحل کی طرف دیکھا۔

سنہرے بالوں والی لڑکی نے اپنا سر اپنے محبوب کے کندھے پر رکھ دیا تھا، اور اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں!

خوابوں کے جزیرے!

سپیرن

ایک روز میں اپنی ماں کے کمرے میں اپنی گیند لینے جا رہا تھا کہ میں نے دروازے کی اوٹ میں سے اپنی ماں کو یہ کہتے سنا۔

"ہٹو۔ مجھے مت چھوؤ" ماں کہہ رہی تھیں۔

"کیوں نہ چھوؤں؟" یہ میرے پتا جی کی آواز تھی۔

"آج سنکرانت ہے"

"سنکرانت ہے تو کیا ہوا؟"

"سنکرانت میں نہیں چھوتے!" ماں جی بولیں۔

"تو کل!" میرے پتا جی نے پوچھا۔

"کل؟ — کل تو بامن اوتار کا دن ہے!"

"اچھا تو پرسوں؟"

"اُوں؟ — پرسوں؟ — پرسوں شاہ مراد کی نیاز کا دن ہے! بھول گئے۔ نیاز دینے کے لئے ہمیں بھی مزار پر چلنا ہوگا۔ میاں رمضانی کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی مزار پر نہیں آتے! کیوں؟ — اسے ہٹو — ہٹو..... کہے دیتی ہوں، مجھ ہاتھ لگایا تو دوبارہ اشنان کرنا پڑے گا!"

تھوڑی دیر کے بعد پتاجی کمرے سے باہر نکلے، مگر بے حد جھنجلائے ہوئے اور جھلائے ہوئے۔ اچھا ہوا میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا، ورنہ مجھ پر ضرور خفا ہوتے۔ ماں جی اور پتاجی ضرور اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ بچوں کو بڑوں کی باتیں نہیں سننا چاہیئے یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بڑے تو ہماری ہر بات سُن لیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات اس قدر کرید کرید کر پوچھتے ہیں۔ اور ہم جو کہیں سے دو باتیں سُن پائیں تو مار کھائیں۔ پتاجی کے جانے کے بعد میں دوڑتا ہوا ماں کے کمرے میں گھس گیا، اور جاتے ہی ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگا۔

"ماں جی۔ میں نے چھو لیا! چھو لیا!! چھو لیا!!!"

میں نے سوچا تھا، ماں جی خفا ہوں گی۔ جھلائیں گی۔ اونچا بولیں گی۔ مگر وہ تو کچھ نہ بولیں۔ وہ اپنی کپڑا سینے کی مشین پر غلاف چڑھا رہی تھیں مجھے اپنی ٹانگوں سے لپیٹے دیکھ کر مسکرائیں۔ جھک کر انہوں نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا، اور پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"کاکا! تو نے ناشتہ کر لیا؟"

"ہاں ماں!"

"اور لال شربت پی لیا؟"

"ہاں ماں!"

ماں نے مجھے دونوں گالوں سے چوما۔ پھر گود سے اُتار کر بولیں۔

"تو جاؤ۔ اب باہر باغ میں کھیلو!"

ماں جی اس وقت مجھ سے خوش نظر آتی تھی۔ میں نے سوچا، یہ موقع اچھا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھ لیا۔

"ماں جی! ایک بات بتاؤ!"

"ہاں؟"

"میں نے تمہیں چھوا، تو تم کچھ نہ بولیں۔ ابھی پتاجی تمہیں چھونے کو

کہہ رہے تھے، تو تم ہٹو ہٹو کیوں کہہ رہی تھیں؟"

ماں جی کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم غصے سے لال ہو گیا۔ وہ کھڑی تھیں۔ یکایک ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ لیا۔ اور مجھے زور زور سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

"تم ہماری باتیں سُن رہے تھے بدمعاش؟"

میں سہم گیا۔ مگر ماں جی مجھے برابر غصے میں اس طرح ہلا رہی تھیں جس طرح پتاجی دوا پلاتے وقت دوا کی شیشی زور زور سے ہلاتے ہیں تو میں نے کانپ کر اقبال کیا۔

"ہاں! میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ مگر میں نے سنا نہیں ماں وہ تو خود سے میرے کانوں میں پڑ گیا — میں تو اپنی گیند لینے ......"

مگر ماں نے آگے کا فقرہ مکمل ہونے نہیں دیا۔ تڑاخ تڑاخ دو تین چار طمانچے میرے رخساروں پر پڑے۔

"تجھے دس بار کہا ہے، بڑوں کی باتیں مت سنو۔ مت سنو!! مت سنو!!! تو پھر بھی نہیں مانتا ہے۔ ایں؟ (ایک طمانچہ) ایں؟ (دوسرا طمانچہ) ایں؟ (تیسرا طمانچہ) ڈھیٹ۔ سُور ......!"

نہ جانے مجھے ابھی اور کتنے طمانچے پڑتے۔ اگر اسی وقت کمرے صاف کرنے والی ملازمہ بیگم بھاگی بھاگی اندر نہ آتی۔ اس نے دوڑ کر زبردستی

پسینہ

مجھے میری ماں سے چھین لیا، اور بولی "اب کیا اسے مار ہی ڈالو گی ــ ؟
تمہارا غصہ تو اندھے کا غصہ ہے مالکن۔ مارتے وقت آنکھا پیچھا کچھ نہیں
دیکھتی ہو۔"

بیگم نے میرے آنسو پونچھے۔ میرا منہ دھویا۔ میرا منہ چوما۔ مجھے اپنے
گدگدے سینے سے لگایا۔ اور جب میری سسکیاں بند ہو گئیں، تو وہ مجھے
بنگلے کے پچھواڑے کی طرف لے گئی۔ جہاں پالتو کبوتروں کی چھتری تھی۔ بیگم
نے ایک کبوتر پکڑ کر میرے ہاتھ میں دیا، اور بولی۔

"لو اب اس سے کھیلو!"

یہ کہہ کر وہ مجھے پچھواڑے چھوڑ کر کام کرنے کے لیے اندر چلی گئی۔
میں کچھ دیر تک تو کبوتروں سے کھیلتا رہا۔ پھر بلّی کے بچوں سے
کھیلتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں میں کب تک کھیلتا رہا۔

یکایک میں نے محسوس کیا، جیسے بنگلے سے باہر لکڑی کے جنگلے
سے پرے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں نے سر اٹھا کے

اچھی طرح سے دیکھا۔

وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اس کا رنگ تانبے کا سا تھا۔ آنکھیں گہری سبز تھیں۔ بال اُلجھے اُلجھے سے تھے۔ اس نے لال سوسی کی ایک تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔ جس سے اس کا سینہ اُبھر آیا تھا۔ اور اس کے سینے پر چاندی کی زنجیریں اور رنگ برنگے منکوں کی مالائیں پڑی تھیں۔ اس کے کان میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ وہ جب بات کرتی تھی تو بڑے مزے سے جھولتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اس کے رخسار سے بھی لگ جاتیں۔ کیوں کہ وہ بالیاں بہت ہی بڑی تھیں۔ اور جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، اور ہنسی تو مجھے اس کے دانت شونتی کی کلیوں کی طرح بالکل چھوٹے چھوٹے اور بے انتہا سفید معلوم ہوئے۔ ایسے سفید دانت میرے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ماں جی مجھے دن میں دو بار برش کرواتی ہیں!

لال سوسی کی قمیص کے نیچے اس نے ایک گھیرے دار لہنگا پہن رکھا تھا۔ جس پر کئی رنگ اور کئی طرح کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ اور کئی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی سلے ہوئے تھے۔ مگر اس کے پاؤں ننگے تھے۔ اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ اور اس نے اپنے کندھے پر دو ٹوکریاں لٹکا رکھی تھیں۔

جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو!"

جنگلے کے باہر کھڑے کھڑے اس نے اپنے بائیں پاؤں سے اپنا دایاں پاؤں کھجایا۔ اور بولی "میں سپیرن ہوں۔ میرے پاس بہت عمدہ عمدہ سانپ ہیں۔ دیکھو گے؟

"ہاں دیکھوں گا" میں نے خوش ہو کر کہا۔

پھر فوراً ہی مایوس ہو کر بولا ـــــ

"مگر تمہارے پاس تو بین بھی نہیں ہے!"

"ہے! کیوں نہیں ہے؟"

سپیرن اپنا کندھا جھٹک کر بولی، اور پیٹھ پر لٹکی ہوئی بین سامنے آ گئی۔

"یہ دیکھو!"

میں نے خوشی سے دونوں ہاتھوں سے تالی مار کر کہا۔

"پہلے تم مجھے بین بجا کر دکھاؤ"

وہ بولی "نہیں پہلے تم مجھے ایک آنہ دو!"

میرا دل ایک دم سے بیٹھ گیا۔

"ایک آنہ تو میرے پاس نہیں ہے!" میں نے بالکل مایوس ہو کر کہا

"تو اپنی ماں سے مانگ لاؤ!"

"وہ نہیں دیں گی۔ وہ مجھے سانپ بھی نہیں دیکھنے دیں گی۔ انہیں سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے!"

"تو اپنے باپ سے مانگ لاؤ!" سبیرن نے مجھے سمجھایا۔

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے!"

یکایک میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اور میں چھلانگ مار کر لکڑی کے جنگلے سے کود کر سبیرن کے پاس چلا گیا۔

"چلو، میں تمہیں پتاجی سے ایک آنہ لے کے دیتا ہوں۔"

میں باغ کی روشوں پر دوڑتا دوڑتا سبیرن کے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے پتاجی مل گئے، جو اسپتال سے واپس آ رہے تھے اور مویشی خانے کے قریب کھڑے ہو کر مالی سے بات کر رہے تھے، جو سونف کی جھاڑیوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ کے قریب بیٹھا ہوا اپنی کھرپی چلا رہا تھا۔ سونف کا جھنڈ قد میں مجھ سے دگنا ہو گا۔ پتاجی اس جھنڈ کے دوسری طرف تھے، اور ہم لوگ اس طرف تھے۔ اس لئے پتاجی نے مجھے آتے ہوئے نہ دیکھا۔ میں بھی صرف ان کے سینے سے اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا، اور وہ بھی مجھے نہ دیکھ سکے تھے۔ انہوں نے صرف اتنا

دیکھا کہ اُلجھے اُلجھے سیاہ بالوں کے ہالے میں گہری سبز آنکھوں والا ایک چہرہ سونف کی مہکتی ہوئی پھننگوں پر پھیلتا ہوا اُن کے سامنے چلا آرہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔

"تم کون ہو؟"

"میں سپیرن ہوں!"

"یہ کام تو مردوں کا ہے!"

"میرا باپ سپیرا تھا۔ جب وہ مر گیا، تو میں نے یہ کام سنبھال لیا!"

"کیوں؟ تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے؟"

"نہیں، صرف ایک اندھی ماں ہے! اور وہ بہت بوڑھی ہے!"

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے سپیرن شاید مجھے بھول بھی چکی تھی۔ شروع میں میرا ارادہ دخل دینے کا تھا اور چیخ کر اپنی موجودگی جتانے کا بھی تھا۔ مگر جب دو بڑوں میں گفتگو شروع ہو جائے، تو اس میں بچوں کا دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔ اور ابھی ابھی میں اپنی ماں سے پٹ بھی چکا تھا۔ مگر ان لوگوں کی باتیں ہونی ہیں دلچسپ!

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد میرے پتاجی مسکرائے، بولے:
"تم سانپ پکڑ سکتی ہو؟"
سپیرن نے بے خوف نگاہوں سے انہیں تکتے ہوئے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا!
"ناگ بھی؟" پتاجی شریر نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے بولے۔
سپیرن مسکرائی۔ ہنس کر بولی "بڑے سے بڑا ناگ بھی میری بین کی آواز سن کر چھپا نہیں رہ سکتا۔ مست ہو کر میری بین پر جھومنے لگے گا!
"ہمارے باغ میں بہت سے سانپ رہتے ہیں۔ کیا وہ تم سب پکڑ لو گی؟"
"سب پکڑ لوں گی! مگر تم دو گے کیا؟"
میرے پتاجی خاموش کھڑے رہے۔ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔
"اور اگر میں تمہیں کچھ نہ دوں تو — !"
سپیرن نے دیر تک میرے پتا کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے بالکل قریب آ گئی۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میرے والد کی بڑی بڑی بے خوف آنکھوں، مضبوط اور وجیہہ چہرے کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی۔ یکایک اس نے آنکھیں نیچے جھکا لیں،

آہستہ سے کمزور آواز میں بولی۔

"اچھا!"

جس طرح سے اُس نے 'اچھا' کہا، وہ مجھے بہت برا معلوم ہوا مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی آواز رو رہی ہو، اور کراہ رہی ہو۔ جیسے دور سے باغ میں کوئی اَن جانی ہوا آئی تھی، اور سسکیاں لے کر چلی گئی۔ کبھی کبھی دوپہر میں ہمارے باغ میں بالکل اسی طرح ہوا روتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے مالی سے کئی بار اس کی وجہ پوچھی ہے مگر وہ ہمیشہ مجھے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ کہتا ہے:

"یہ تمہارا وہم ہے کاکا! ہوا تو بس ہوا ہے، وہ نہ روتی ہے' نہ گاتی ہے۔ وہ تو بس درختوں کے پتوں کو چھیڑتی ہوئی گذر جاتی ہے۔"

مگر اس وقت ہوا نے نہ جانے کس کو چھیڑا تھا۔

میرے پتا بولے۔

"تم کہاں رہتی ہو ــــ؟"

"آج ہی تو یہاں آئی ہوں۔ ابھی رہنے کا ٹھکانہ کہیں نہیں بنایا۔ ویسے میں اپنی ماں کے ساتھ بلسے پور کے گاؤں میں رہتی ہوں۔"

"تم اکیلی گھومتی ہو۔ تمہیں مردوں سے ڈر نہیں لگتا؟"

پیپرن بولی: "میرے سانپ میری حفاظت کرتے ہیں۔ مجھے تو

نہیں، البتہ مردوں کو مجھ سے ڈر لگتا ہوگا!"

"ہمارے باغ میں ایک ناگ ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا!" میرے باپ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کہاں رہتا ہے وہ؟ مجھے اس کا بل بتا دو، یا رہنے کی جگہ دکھا دو میں اسے پکڑ لوں گی۔ میری بین میں ایسا جادو ہے جس سے بڑے سے بڑا ناگ بھی نہیں بچ سکتا!"

میرے پتا بولے "میں مالی سے کہے دیتا ہوں۔ وہ تمہیں اپنے گھر رکھ لے گا۔ اور جب تک تم ہمارے باغ کے سانپ پکڑو گی، اُس کے گھر ہی رہو گی، اور میں تمہیں ایک سانپ پکڑنے پر ایک اٹھنی دیا کروں گا، مگر خبردار تم ہمارے باغ کے ناگ کے بل پر مت جانا! اُس کے کاٹے کا منتر نہیں ہے!"

"جاؤ! جاؤ!" —— سپیرن اپنی چھوٹی سی زبان نکال کر میرے باپ کو چڑاتے ہوئے بولی۔

پھر اُس نے اپنی بین اس کے سامنے جھلائی، اور بولی ——

"بتاؤ تو سہی، کدھر ہے وہ تمہارا ناگ؟"

"چلو تمہیں دکھاؤں!"

پتا جی کو خیر معلوم نہ تھا کہ میں سونف کے جھنڈ کے اس طرف

پیپیرن کے اس قدر قریب کھڑا ہوں۔ مگر پیپیرن کیوں مجھے بھول گئی تھی وہ میری طرف سے بالکل انجان ہو کر میرے پتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں بھی ذرا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے پیڑوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔

چیری کے درختوں سے گذر کر وہ لوگ آڑوؤں کے جھنڈ میں پہونچے وہاں سے گذر کر اخروٹ کے درختوں کے قریب ایک چھوٹے سے ٹیلے پر جا کے رک گئے۔

میرے پتا بولے: "وہ ناگ یہاں رہتا ہے!"

"اس ٹیلے کے اندر؟"

"ہاں! کہتے ہیں: اس ٹیلے کے اندر سیداں بی کی قبر ہے!"

"سیداں بی کون تھی؟"

"یہ تو کوئی نہیں جانتا سیداں بی کون تھی؟ مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑی خوب صورت تھی۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے، جب یہاں پر نہ یہ باغ تھا نہ اسپتال تھا، نہ راجہ جی کا محل تھا۔ ان دنوں مغل شہزادے کا ایک قافلہ ادھر سے گذرا تھا، اور سیداں بی اس مغل شہزادے پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ مغل شہزادہ اپنے باپ سے بھاگ کے یہاں آیا تھا اور چھ ماہ سیداں بی کے گھر میں رہا تھا۔"

"پھر؟"

"چھ ماہ بعد مغل شہزادے کو شاہی دربار سے پیام آیا۔ اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا تھا، اور اب وہ اسے واپس بلا رہا تھا"

"پھر؟"

"پھر مغل شہزادہ چلا گیا! ــــ اور سیداں بی سے کہہ گیا، کہ وہ اسے شاہی دربار سے بلا بھیجے گا! ــــ سیداں بی زندگی بھر مغل شہزادے کے بلاوے کا انتظار کرتی رہی...... یہاں وہ دفن ہے!"

سپیرن کچھ نہ بولی!

وہ جھک کر اور پاؤں پسار کر ٹیلے کے قریب بیٹھ گئی۔

اُس نے ٹوکریاں کندھے سے اتار کر الگ رکھ دیں، اور آنکھیں بند کر کے بین بجانے لگی!

سچ مچ اس کی بین کی آواز بڑی من موہنی تھی، جیسے وہ بین رو رو کر پکار رہی ہو۔ کسی کو بلا رہی ہو، جیسے وہ بین زخمی ہو اور مرہم چاہتی ہو۔ جیسے وہ ایک بھولا بھٹکا ہوا بچہ ہو، اور راستہ پوچھتی ہو:

کدھر ــ؟

کدھر ــ؟؟

وہ دیر تک بین بجاتی رہی۔
مگر میں نے دیکھا، اس کے بین بجانے پر بھی کوئی ناگ بٹیلے سے باہر نہیں نکلا۔ ہاں میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے!

(۲)

"اُدھر مالی کے گھر میں ایک سپیرن آئی ہے!" میں نے اپنی ماں سے کہا۔

"سپیرن ـــ ؟"

"ہاں، سانپ پکڑنے والی سپیرن! پتا جی نے اُسے نوکر رکھا ہے۔ ایک سانپ پکڑنے پر اسے آٹھ آنے ملیں گے!"

"مگر تیرے پتا نے تو مجھے بالکل نہیں بتایا...." پھر وہ جلدی سے بولیں ـــ

"اچھا چل مجھے دکھا... کدھر ہے وہ سپیرن؟"
میں ماں کو مالی کے گھر لے گیا!
مالی کا گھر مٹی کا تھا، اور اس میں صرف دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک۔

کوٹھری میں سیپرن اپنے بال کھولے ایک ٹوٹا آئینہ اپنے سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ جب اس نے میری ماں کو اپنے سامنے دیکھا، تو کنگھی کرتے کرتے رک گئی۔ اُس کی گہری سبز آنکھیں یکا یک یوں چمک اٹھیں جیسے کوئی ندی کے گہرے پانی میں زور سے پتھر پھینک دے!

پھر اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں جھکا لیں.....

میری ماں اسے ایک نظر دیکھ کر الٹے قدم لوٹ آئیں۔ باہر آ کر مالی سے بولیں جو اپنی بیمار بیوی کے پاؤں داب رہا تھا۔

"ارے یہ سانپ کیا پکڑے گی؟ یہ تو خود ناگن ہے ناگن!"

میری ماں کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ماں اس کو ناگن کیسے کہہ رہی تھیں۔ سیپرن تو بالکل میری ماں کی طرح ایک عورت تھی، وہ ناگن کیسے ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ بڑے لوگ کبھی کبھی انتہائی حماقت کی باتیں کر جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا:

"مگر وہ تو ایک عورت ہے جس طرح دوسری عورتیں ہوتی ہیں' ماں، اس کو تم نے ناگن کیسے کہہ دیا؟"

"تم نہیں سمجھتے!" میری ماں تنک کر مجھ سے بولیں"۔ اور تم سے کس نے کہا ہے کہ بڑوں کی باتوں میں بولا کرو؟ میں تم سے دس بار کہہ

چکی ہوں۔ بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو — ورنہ ....!"
میں چپ ہو گیا، اور سہم کر ذرا پیچھے ہٹ گیا۔
ماں جی مجھے جلدی جلدی چلا کر، بلکہ تقریباً دوڑا کر واپس بنگلے میں لے گئیں۔

رات کو جب میری ماں نے سمجھا کہ اب میں گہری نیند سو چکا ہوں۔ حالانکہ میں جاگ رہا تھا، اور محض آنکھیں بند کر کے بستر میں دبکا پڑا تھا۔
اس وقت میری ماں میرے پتاجی سے لڑنے لگیں ....
"اس جنم جلی سپیرن کو تم نے نوکر رکھا ہے؟"
"ہاں!"
"کیوں؟"
"سانپ مارنے کے لیے!"
"تو اس کام کے لیے کوئی سپیرا نہیں ملتا تھا؟"
"نہیں ملا تھا — جبھی تو اس کو رکھا ہے!"
"میں نہیں مانتی۔"

"نہیں مانتیں، تو تم کوئی سپیرا لا دو۔ میں اسے نکال کر اُسے رکھ لوں گا!"

"کسی سپیرے یا سپیرن کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں نے تو نہیں دیکھا باغ میں کسی سانپ نے آج تک کسی کو کاٹا ہو!"

"کاٹا نہ ہو، مگر کاٹ تو سکتا ہے!"

"یہ سب تمہاری فضول باتیں ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں —— وہ سپیرن کل یہاں سے جائے گی!؟"

"وہ نہیں جائے گی!"

"وہ جائے گی!!"

"وہ نہیں جائے گی!!!"

"میں اس کو جھاڑو مار کے نکال دوں گی!" میری ماں یہ کہتے کہتے رونے لگیں۔

"پگلی ہوئی ہو" —— میرے پتا خفا ہو کے بولے "چند روز کی بات ہے۔ جب وہ باغ کے سانپ پکڑ لے گی خود ہی چلی جائے گی —— دن بھر تمہارا بچہ باغ میں کھیلتا رہتا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کے بھلے ہی کے لئے کہہ رہا ہوں!"

یہ سن کر یکایک میری ماں روتے روتے چپ ہو گئیں، جیسے ان کے دل

پیسیرن

کو یقین آچلا ہو۔ بولیں ۔

"سچ کہتے ہو؟"

اُن کے لہجے میں آدھا شک تھا، آدھا یقین تھا۔

پتا جی نے میری ماں کے آنسو پونچھے، اور انہیں پیار کر کے کہا۔

"پگلی! اس قدر نادان نہ بن۔ کیا تجھے ابھی تک میری محبت کا یقین نہیں ہے؟"

میری ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ کروٹ بدل کر میرے باپ کی باہنہ پر سو گئیں۔

مگر تین چار دن کے بعد انہوں نے پھر پتا جی سے لڑائی شروع کر دی۔ ہوا یہ تھا کہ ماں جی نے میرے پتا جی کو سیداں بی کے بیٹے کے پیچھے گھسر پھسر کرتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی، اب وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں کہ:

"یا تو اب میں یہاں رہوں گی، یا وہ سبز آنکھوں والی ناگن رہے گی!"

اور پتا جی کہہ رہے تھے ...

"آہستہ بات کرو ــــ آہستہ بات کرو ــــ کوئی سُن لے گا ــ بچہ جاگ جائے گا !"

اور ماں جی کہنے لگیں ۔

"جاگ جائے بچہ ۔ سُن لے بچہ ۔ میرا بچہ کیا ، سارا جہاں سُن لے ۔ تمہارے ایسا بےوفا مرد اس دنیا میں کوئی نہ ہو گا ۔ مجھے میرے میکے بھیج دو ۔ میں یہاں ایک پل کے لئے نہیں رہوں گی ۔ اگر وہ ــــ کل موہنی یہاں سے نہیں جائے گی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی ۔

"اور تین دنوں میں اس نے باغ میں سے بیس سانپ پکڑے ہیں !"

"بیس پکڑے ہوں یا پچاس پکڑے ہوں ۔ میں کل اس کی چُٹیا پکڑ کر اُسے اپنے احاطے سے باہر پھینک دُوں گی !"

"تمہاری جیسی شکی عورت میں نے نہیں دیکھی ۔ خواہ مخواہ شبہ کرنے لگ جاتی ہو ۔"

"تو تم اس کو یہاں رکھ کر میرا شبہ کیوں مضبوط کرتے ہو ؟"

میری ماں غصے سے چلائی ۔

"اچھا بابا ــ اچھا بابا ۔ ہم ہارا تو جیتی ۔ میں اس کو ایک ہفتے کے بعد نکال دوں گا ۔ اس ایک ہفتے میں جتنے سانپ وہ باغ

سے نکال سکتی ہے، اسے نکال لینے دے۔ اس بیچ میں اس سے جھگڑا مت کر، اپنے دل کو ہلکان مت کر، میں جو کچھ کر رہا ہوں، تیرے بچے کی حفاظت کے لئے کر رہا ہوں!"

"اچھا تو بس ایک ہفتہ!"

"ہاں بس ایک ہفتہ!"

"اور اس سے اوپر ایک دن نہیں!"

"ایک لمحہ نہیں!" — میرے باپ نے میری ماں کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔

میں نے ایک آنکھ آہستہ سے کھولی، اور پھر فوراً بند کر لی۔ میری ماں اطمینان کا سانس لے کر بولیں:

"جب تم ..... اس طرح بات کرتے ہو، تو میرے دل کو یقین آجاتا ہے!"

میرے والد نے سپیرن سے کہہ دیا تھا کہ سات دن کے بعد اسے یہاں سے چلا جانا ہوگا۔ اتنے دن میں وہ جتنے سانپ پکڑ سکتی ہے، پکڑ لے۔

پیبیرن اُن کی بات سن کر چُپ ہوگئی تھی۔ اس نے ایک بار غور سے میرے باپ کی طرف دیکھا تھا، مگر وہاں اپنے مطلب کی کوئی بات نہ پاکر وہ مایوس ہوگئی تھی، اور چُپ چاپ منہ موڑ کر سیداں بی کے ٹیلے کی طرف چل دی۔ اور وہاں پاؤں پسار کے زور زور سے بین بجانے لگی۔ آج اس کی بین میں مٹھاس نہ تھی، مستی نہ تھی، دُکھ نہ تھا، درد نہ تھا، صرف غم اور غصہ تھا —— اور کچھ ایسی بے چین لہر اور تڑپ تھی جیسے ڈنک سے خالی ناگن بل کھا کھا کر زہر مانگ رہی ہو!

ساتویں دن —— جس دن پیبیرن جانے والی تھی۔ اُس دن میری ماں کو ایک سانپ نے کاٹ کھایا —— میری ماں برآمدے کی دیوار سے لگی عشق پیچاں کی بیل کو پانی دے رہی تھیں کہ ان کے پاؤں کے نیچے جانے کہاں سے ایک سانپ آگیا۔ اور اس نے فوراً انہیں ٹخنے سے اوپر کاٹ کھایا۔ میری ماں اُسی دم چیخ مار کر گر پڑیں، اور دم بدم نیلی ہوتی گئیں۔

اور امریک سنگھ باورچی نے اسی وقت کس کر رسی سے دو جگہ

پاؤں باندھ دیا، اور بھاگ کر پتاجی کو بُلا لایا۔

پتاجی نے آتے ہی، جہاں پر سانپ نے کاٹ کھایا تھا، وہاں پر نشتر سے شگاف کر کے بہت سا خون بہا دیا۔ اور زخم میں پوٹاشیم پرمینگنیٹ بھر دیا کہ ان دنوں ہمارے یہاں سانپ کے زہر کے انجکشن نہیں ملتے تھے، اور بس میرے پتاجی سانپ کے کاٹے کا یہی علاج کرتے تھے۔ جس سے کبھی تو مریض بچ جاتے تھے، اور اکثر اوقات مر جاتے تھے.....

میری ماں بے ہوش تھیں، اور نیلی پڑتی جا رہی تھیں، اور ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔

اور میں انہیں دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا!

یکایک میرے پتاجی وہاں سے اُٹھے، اور سیدھے مالی کے گھر گئے۔ اس وقت سپیرن اپنا سامان باندھ چکی تھی۔ آج اُس نے اپنا لہنگا اور قمیص دونوں دھو کر صاف ستھرے کر لئے تھے۔ بالوں میں کنگھی کی تھی۔ ندی کی نرم ریت سے رگڑ رگڑ کر اپنے چاندی کے زیور

چمکا لئے تھے۔ اخروٹ کی چھال سے اپنے ہونٹ سُرخ کئے تھے، اور بالوں میں گلاب کا ایک بڑا پھول لگا رکھا تھا، اور اب وہ جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔

"رانو چلو!"

"کہاں؟"

"وہ مر رہی ہے۔ اُسے بچا لو!"

"نہیں، اُسے مرنے دو!"

"نہیں رانو، مانو۔ اسے بچا لو۔ میری دوا کام نہیں کر رہی ہے۔"

"میرے پاس کوئی دوا نہیں ہے۔ میں سانپ پکڑتی ہوں، سانپ کا زہر دور نہیں کر سکتی!"

"تم دور کر سکتی ہو۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاس سانپ کے کاٹے کی بہترین دوا ہے!"

"وہ میں نے کہیں کھو دی ہے!" سپیرن منہ موڑ کر بولی۔ اُس کے لہجے میں انتہائی سختی اور بیزاری تھی....

میرے پتا نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا، اور روتے ہوئے کہا "نہیں رانو مانو۔ اسے بچا لو۔ کسی طرح سے بھی بچا لو۔ اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا!"

پیمبرن نے پلٹ کر میرے باپ کی طرف دیکھا، آہستہ سے بولی۔ اُس کے لئے تم روتے ہو، اور میرے لئے تمہارے پاس ایک آنسو بھی نہیں ہے!"

میرے باپ نے سر جھکا لیا۔ وہ چُپ چاپ پیمبرن کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خاموش، مجرم کی طرح!
پیمبرن نے ایک آہ بھری۔ اُس نے اپنی دونوں ٹوکریاں اٹھائیں اور بولی:

"اچھا، جو تم چاہتے ہو، وہی ہوگا!"
وہ میرے باپ کے ساتھ میری ماں کے بستر پر آئی۔ اس نے میری ماں کے زخم سے اپنے ہونٹ لگا دیئے۔ اور اپنے ہونٹوں سے چوس چوس کر زخم کا بہت سا خون باہر تھوک دیا۔ پھر اس نے اپنے جھولے کو ٹٹول کر اس میں سے ایک کالی سی ڈبیہ نکالی، اور اسے کھول کر اُس میں سے ایک سبز رنگ کا مرہم زخم پر لگایا۔
اُس کے بعد وہ باہر باغ میں دوڑی دوڑی گئی، اور دیر تک کچھ تلاش کرتی رہی، آخر ایک ڈھکی کے کنارے سے وہ ایک بڑے بڑے لمبوترے پتوں والا ایک پودا اُکھاڑ لائی، اور ان پتوں کو ایک کھرل میں کوٹ کر اس کا رس نکال کے میری ماں کے ہونٹوں میں

ٹپکانے لگی۔

دو گھنٹے کے بعد میری ماں کے منہ سے جھاگ نکلنا بند ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے بدن کا نیلا پن دُور ہوتا گیا۔ پھر دھیرے دھیرے میری ماں نے آنکھیں کھولیں

اور جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو سپیرن آہستہ سے پرے ہٹ گئی اور میرے پتا جی آگے آ گئے۔ اور انہوں نے بڑے پیار سے میری ماں کا چہرہ اپنے زانو پر لے لیا۔ اور پوچھا:

"اب کیسی ہو؟"

میری ماں نے کمزور آواز میں کہا: "معلوم ہوتا ہے بچ جاؤں گی۔ میرا لال کہاں ہے؟"

میں روتا روتا اپنی ماں کے گلے سے لگ گیا!

تھوڑی دیر میں میں، اماں اور میرا باپ ہم تینوں خوشی کی سسکیاں بھر رہے تھے.....

یکایک میرے والد کو کچھ یاد آیا۔ انہوں نے کہا: "جانکی! تمہیں معلوم ہے تمہاری جان کس نے بچائی ہے؟"

ماں نے خاموشی سے انکار میں سر ہلایا۔

میرے باپ نے پلٹ کر کہا۔

"رانو! آگے آؤ!!"

مگر جب میرے باپ نے پلٹتے ہوئے یہ فقرہ کہا، اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ سپیرن جا چکی تھی۔

سپیرن پھر کبھی لوٹ کر ہمارے علاقے میں نہیں آئی۔ ہاں سردی کی راتوں میں، جب چاروں طرف برف پڑ جاتی ہے تو کبھی کبھی ندی کے اُس پار سے بین کی تڑپتی ہوئی صدا آتی ہے، جسے سُن کر میرے والد اپنے کمرے سے باہر نکل آتے ہیں، اور بے چین ہو کر برآمدے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور وہ آواز دُور ندی کے پانیوں سے پرے ہوا کے دوش پر لرزتی ہوئی اس طرح آتی ہے جیسے ویران برف زاروں میں کوئی بالک کھو جائے، اور بلک بلک کر اپنا راستہ پوچھے......؟

صہبا لکھنوی

کرشن چندر

(ایک مطالعہ)

کرشن چندر ۲۶ر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تین سال کی عمر میں کشمیر چلے گئے — بچپن اور جوانی کا ایک حصہ وہیں گذرا — تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی — فارمن کرسچین کالج سے ایم اے کیا۔ ایم اے کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ ریڈیو کی ملازمت کی، پھر فلمی دنیا میں قدم رکھا، لیکن انہیں یہاں کا ماحول راس نہ آیا

افسانہ نگاری انہوں نے ۲۳ برس کی عمر سے شروع کی۔ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ زندگی کے مسائل پر کہانیاں لکھیں ــــ وہ کیوں اور کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ اور ان کا علاج کیا ہے؟ کہانیوں کا تار و پود بنتے وقت وہ ہمیشہ عام فہم، خوب صورت اور دل نشیں اردو لکھتے ہیں ــــ عام طور پر ہلکا نیلا یا نیلا کاغذ استعمال کرتے ہیں جو ان کا پسندیدہ رنگ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمدہ کاغذ کی تلاش میں انہوں نے اکثر سارا شہر چھان مارا ہے۔ وہ عام طور پر صبح کے وقت لکھتے ہیں ــــ رات کو بھی کبھی کبھی لکھتے ہیں ــــ اکثر سو کر اُٹھتے ہی لکھنا شروع کر دیتے ہیں، اور ایک ہی نشست میں کہانی مکمل کر لیتے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ غالب، ٹیگور، پریم چند، چیخوف، بالزاک، ٹالسٹائی، گورکی، وکٹر ہیوگو، شکسپیر وغیرہ کی تحریروں سے انہوں نے ہمیشہ گہرا اثر قبول کیا ہے۔

شکست اور اَن داتا سے کرشن کو جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، اُسے انہوں نے آج تک برقرار رکھا ہے، اور برِ صغیر میں انہیں آج اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ عظیم افسانہ نگار ہی نہیں ــــ عظیم انسان بھی ہیں ــــ اس کا اعتراف پاکستان

اور بھارت میں سبھی کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد کتنے ہی بڑے افسانہ نگار تھک کر بیٹھ گئے ـــــ لیکن کرشن اسی رفتار سے کہانیاں اور ناول لکھتے رہے۔ اور اب ان کی عظمت، شہرت اور مقبولیت صرف پاک و ہند تک ہی محدود نہیں، بلکہ دور دراز ملکوں تک پہونچ چکی ہے۔ اُن کی اَن گنت کہانیاں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوکر قبولیت عام حاصل کر چکی ہیں۔ یہ امر بھی باعثِ مسرت ہے کہ کرشن کی زندگی میں ہی ان کے فن پر اردو کے ایک طالب علم احمد حسن الہ آباد یونیورسٹی میں اور ایک طالب علم برلن میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ آزادی کے بعد اگرچہ انہوں نے اپنی تمام پرانی کتابوں کے حقوقِ اشاعت مکتبۂ افکار کراچی کے نام منتقل کر دیئے تھے ـــــ پھر بھی پاک و ہند میں کاپی رائٹ کا معاہدہ نہ ہونے کے باعث کئی ناشروں نے ان کی کتابیں بلا اجازت چھاپ چھاپ کر بے اندازہ نفع کمایا ـــــ آزادی کے بعد ان کی تمام کتابیں مکتبۂ افکار نے ہی روایتی حسن و معیار کے ساتھ شائع کیں ـــــ پہلا افسانوی مجموعہ 'کالا سورج' ۱۹۵۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد تین ناول، آسمان روشن ہے، ایک عورت ہزار دیوانے اور سڑک واپس جاتی ہے علی الترتیب شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ اور اب ایک خوشبو اڑی اڑی سی

اُن کے نئے افسانوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ کرشن چندر کو خود اپنی تمام تصانیف کے نام یاد نہیں — ویسے اس وقت تک انہوں نے ۳۵ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں افسانے، ناول، رپورتاژ، مزاحیہ افسانے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں :-

شکست	مزاحیہ افسانے
طلسمِ خیال	نئے غلام
صبح ہوتی ہے	ایک روپیہ
سمندر دور ہے	دل کی وادیاں سو گئیں
زندگی کے موڑ پر	اَن داتا
ایک گرجا ایک خندق	نغمے کی موت
آسمان روشن ہے	تین غنڈے
پودے	نئے افسانے
طوفان کی کلیاں	اجنتا سے آگے
کتاب کا کفن	کالا سورج
پرانے خدا	پانی کا درخت
ہوائی قلعے	الٹا درخت

ایک عورت ہزار دیوانے	ایک پھول
ہم وحشی ہیں	ایک گدھے کی سرگذشت
جب کھیت جاگے	باون پتے
میں انتظار کروں گا	سڑک واپس جاتی ہے

'نئے زاویے' اور 'ہل کے سائے میں' اُن کے دو مرتبہ مجموعے ہیں
انہوں نے اپنا مشہور ناول 'شکست' صرف ۲۲ دن میں لکھا تھا۔ اُن کا پہلا مضمون مزاحیہ تھا، جو 'ریاست' دہلی میں شائع ہوا تھا۔

کرشن چندر کی مقبول و پسندیدہ تصانیف

جنہیں پہلی بار مکتبۂ افکار کراچی نے روایتی حسن و معیار کے ساتھ شائع کیا

ناول

آسمان روشن ہے	قیمت	۴ روپے
ایک عورت ہزار دیوانے	//	۵ روپے
سڑک واپس جاتی ہے	//	۶ روپے ۷۵ پیسے

افسانے

کالا سورج	قیمت	۴ روپے ۵۰ پیسے
اک خوشبو اڑی اڑی سی	//	۵ روپے ۲۵ پیسے

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

کرشن چندر کے نام سے شائع ہونے والی جعلی اور فرضی کتابوں سے بچئے

ہر کتاب خریدتے وقت مکتبۂ افکار کا مخصوص نشان ضرور دیکھ لیجئے